راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

ستمبر 2019ء

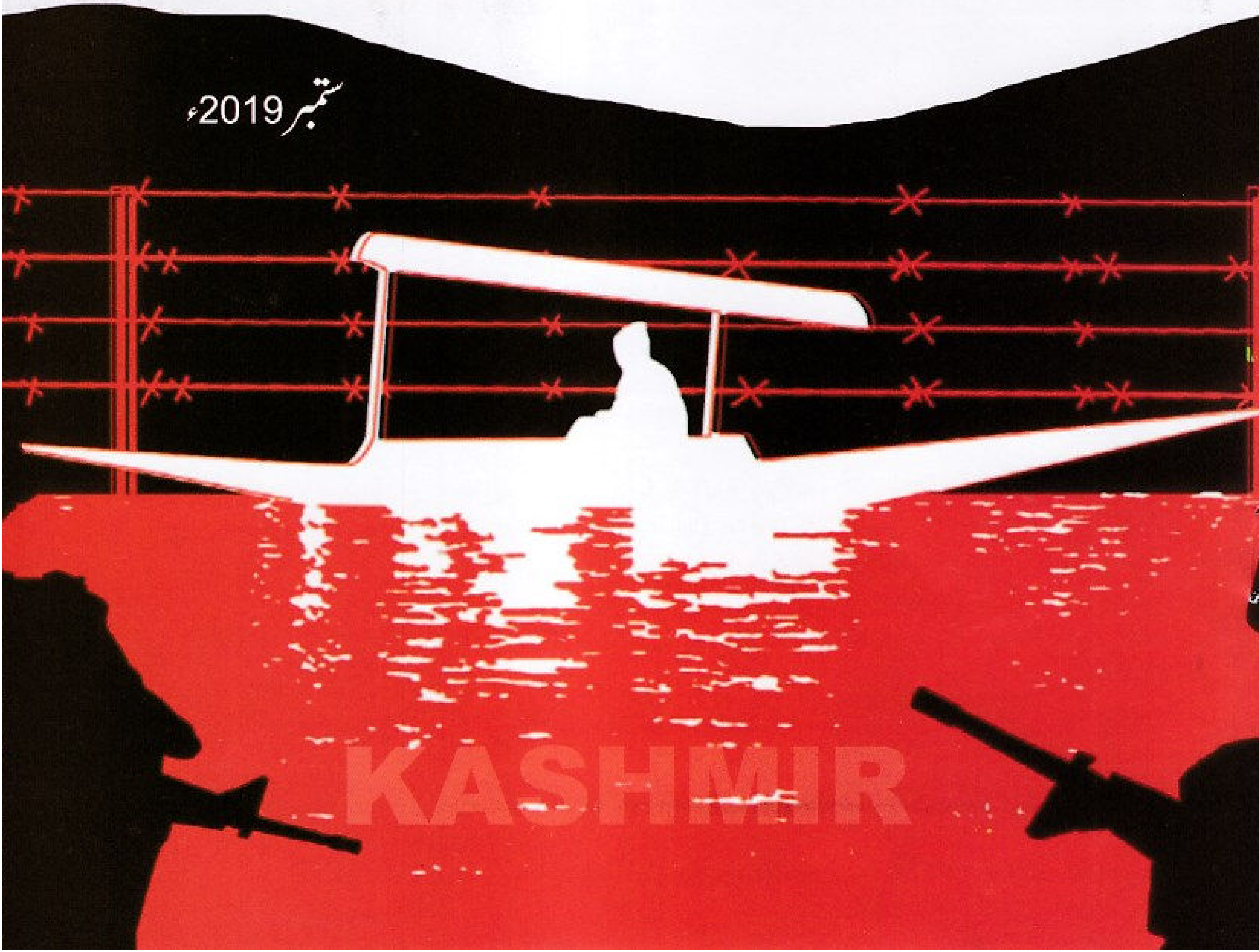

[redacted] واحد مدیر ہوں جسے جنگ اور نوائے وقت دونوں کی ادارت کا اعزاز حاصل ہوا

1971ء کی جنگ میں قیصر ہند میں رپورٹنگ کرتے ہوئے جس پر پاکستانی فوج نے قبضہ کیا

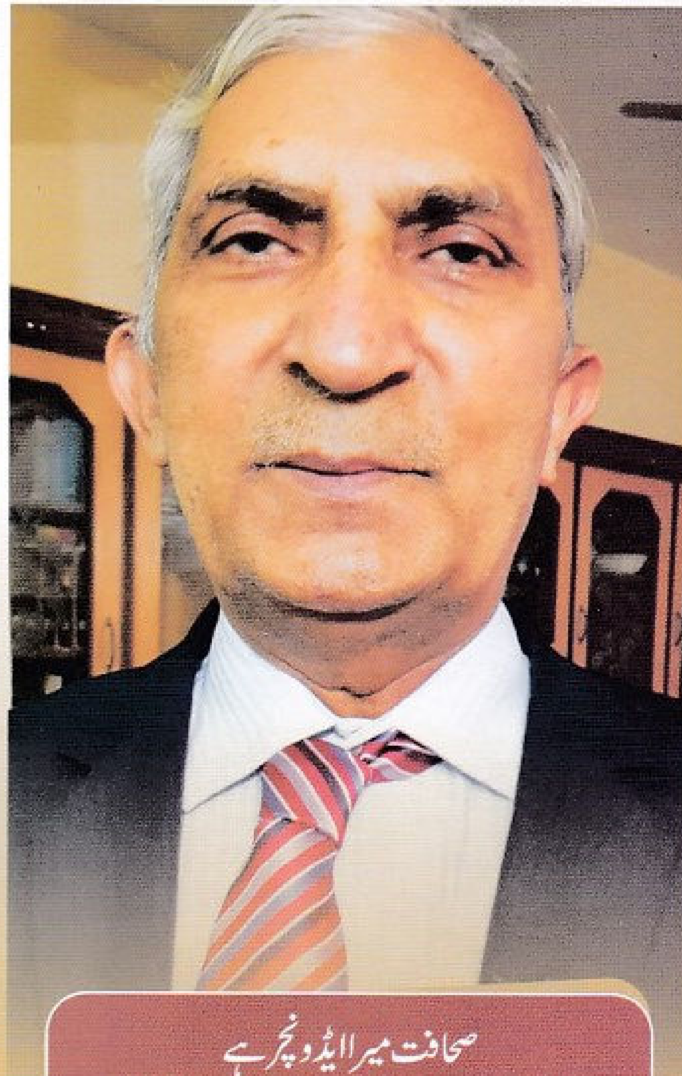

صحافت میرا ایڈونچر ہے

ابتدائے سخن میں اسد حجازی کا قلمی نام اختیار کیا مگر بعد میں ترک کر دیا

نامور مدیر، مقبول کالم نگار اور منفرد ادیب و شاعر

اسد اللہ غالب

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کا مکالمہ

لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ قلمی سفر کے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

اسد اللہ غالب: لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا، یہ ایک کھوج لگانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کا سرا بڑا گنجلک ہے۔ اور ایک دور زمانے کی بات ہے میرا خیال ہے، جب میں نویں اور دسویں جماعت میں تھا تو اس وقت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کا بہت زیادہ مداح تھا۔ ان کی کوئی چیز بھی ملتی تھی تو میں اسے ضرور پڑھتا تھا۔ اور ان کے انداز تحریر کو بھی میری خواہش تھی کہ میں اپناؤں۔ بہرحال نویں اور دسویں جماعت میں ہی میں نے ''ساربان'' نام سے ایک قلمی میگزین شروع کیا۔ اس کا ایک شمارہ بنایا یا دو بنائے۔ اس میں ایڈیٹوریل بھی ہوتا تھا، میری نظم بھی ہوتی تھی، میرے ایک دوست کلاس فیلو محمد علی تھے، میرے ساتھی تھے، ان کی بھی ہوتی تھی۔ کوئی سیاسی تبصرے بھی ہوتے تھے۔ پھر ایک پنجابی میگزین بھی میں نکالا جو شائد اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا اور وہ دیہات میں اور میرے ہی گاؤں میں جو عورتیں لڑتی ہیں ماشاءاللہ۔ اور ایک جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔ دو شیرنیوں کو لڑتے بھڑتے ہوئے ایک دوسرے کو بڑی کلاسیکل قسم کی گالیاں دیتی ہیں۔ اللہ معاف کرے وہ سارا کچھ میں بھی سنتا تھا۔ اور پھر اس کو بڑی تفصیل سے اپنے اس پنجابی رسالے میں لکھتا تھا۔ یہ سلسلہ باقاعدہ نہیں تھا۔ بس ایک ایک دو دو پرچے، وہ بھی نامکمل یہ میں نے میٹرک میں بنائے۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آیا تو سب سے پہلے جب داخلہ ہو جاتا ہے اور بندہ لائبریری کارڈ بنانے جاتا ہے۔ ایک کام یہ بھی ہوتا ہے جیسے ایک شناختی کارڈ بھی بنایا جاتا ہے، یا کالج کا آئی ڈی کارڈ۔ لائبریری کارڈ جب میں بنانے گیا تو جو اس وقت راوی شائع ہوا تھا۔ جو گورنمنٹ کالج کا میگزین ہے۔ محمود شام اس کے ایڈیٹر تھے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 20 ستمبر 2019 شمارہ نمبر 9

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ بشریٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ • زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر • نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناراکاردی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، 2

سلام / ، 3

طنز و مزاح

○ بکروں کا نقطہ نظر / عطاء الحق قاسمی ، 4

مضامین:

○ تہذیبی انسان کے آس پاس / یونس جاوید ، 5

○ ایڈورڈ سعید: دانش ور کے اظہارات / ڈاکٹر ناصر عباس نیر ، 11

○ اُردو زبان میں محاورات کا غلط استعمال / حیات عبداللہ ، 26

○ اُردو محاورات کا استعمال / ڈاکٹر عاصم ثقلین ، 27

○ اے سیدِ لولاکؐ / محمد نوید مرزا ، 28

○ گم شدہ سائے / علامہ عبدالستار عاصم ، 29

○ عمران مفتی / حسن عباسی ، 32

○ ہم زمانے میں خدا جانے کہاں موجود ہیں / حسیب اعجاز عاشر ، 34

شعری گوشے:

○ ڈاکٹر جواز جعفری، فیاض ملک، وحید قندیل، شازیہ رباب ، 36

افسانے

○ عورت / حنیف سیّد ، 40

○ آوارہ / ارم ہاشمی ، 43

شاعری 45

○ چیئرمین کا بندہ (کالم) / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ، 48

سفر نامے

○ پیرو کا تکنا / عامر بن علی ، 49

○ شانزے لیزے پیرس کی سرد شام / ارشد نذیر ساحل ، 51

○ پیرو کا تکنا / عامر بن علی ، 52

○ انٹرویو: اسد اللہ غالب ، 52

○ انٹرویو: کرنل (ر) سیّد مقبول حسین ، 60

مختصر ادبی خبریں ، 61

تبصرہ کتب ، 62

خطوط ، 64

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد ونعت

جن رنگوں میں دیکھی دنیا صاحب کی
اُن رنگوں میں کی ہے پوجا صاحب کی

سورج چاند ستارے اپنے ساتھ لیے
روز گزر جاتی ہے بگیا صاحب کی

اُس کے ہارسنگھار میں ہوں مصروف بہت
میرے گھر آئی ہے گڑیا صاحب کی

جب میں شب کو اُس میں دیپ بہاتا ہوں
سندر ہو جاتی ہے ندیا صاحب کی

بیٹھے بیٹھے میں مجرم بن جاتا ہوں
پنکھے سے ٹکرائے چڑیا صاحب کی

میں تو اُس کو چھونے سے بھی ڈرتا ہوں
چیز ہوا کرتی ہے بڑھیا صاحب کی

اُس کا نشہ ہرگز ٹوٹ نہیں سکتا
جس نے گھول کے پی لی پڑیا صاحب کی

آپ دریچہ کھول کے میرے کمرے کا
مجھ سے ملنے آئی پروا صاحب کی

حسن عباسی/لاہور

نجوم و شمس و قمر، بحر و بر نشاں ہیں ترے
ہوائیں پھول شجر رنگ نغمہ خواں ہیں ترے

جدھر بھی کان دھروں تیرا نام گونجتا ہے
جدھر بھی دیکھتا ہوں قافلے رواں ہیں ترے

مرے شعور سے ہے ماورا تری قدرت
نہ جانے کتنے ہی عالم کہاں کہاں ترے

ہے تو تو سب کا، فقط خوش دلاں ہی تیرے ہیں
فسردگاں ہیں ترے، دل گرفتگاں ہیں ترے

ہماری آنکھ سے اوجھل ہے تیری ذات عظیم
اگرچہ لاکھ کرشمے یہاں وہاں ہیں ترے

عبیداللہ نزاکت/حاصل پور

ہے ضروری کہ ہو خدا سے بات
یعنی محبوبِ کبریاؐ سے بات

بے خیالی میں لطف دیتی ہے
آپؐ کے شہر کی ہوا سے بات

ہے جو مہکی ہوئی درودوں سے
کاش ہو جائے اُس فضا سے بات

رب نے ہر چیز آپؐ کو دی ہے
پوچھ کر آپؐ کی رضا سے بات

اوجِ انسانیت پہ فائز ہے
شاہِ کونینؐ کی خدا سے بات

میں بھی رہتا ہوں گوش برآواز
ہو کبھی مجھ سے بے نوا سے بات

جس سے روشن ہوئے ہیں قلب وجگر
روح کرتی ہے اُس ضیا سے بات

میری لغزش کی ایک بخشش ہے
اُن کی رحمت کی انتہا کی بات

اب سفارش ریاضؔ کی بھی ہو
میری ہے آپؐ کی دُعا سے بات

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

گر چاہیے ہے تجھ کو شفاعت رسولؐ کی
پھر صدقِ دل سے کر تو اطاعت رسولؐ کی

بعد از خدا تو مرتبہ بس آپؐ ہی کا ہے
کیسے بیان مجھ سے ہو عظمت رسولؐ کی

ہیں شاہِ دو جہاں کی غذا سوکھی روٹیاں
یہ سادگی رہی ہے معیشت رسولؐ کی

محفوظ کرلیں سینوں میں اپنے بھی ہم اسے
رب کا کلام تو ہے امانت رسولؐ کی

جتنا بھی اس پہ فخر کروں کم ہے دوستو
شامل ہے میرے نام میں نسبت رسولؐ کی

مولا کریم اپنا کرم کر تو رات دن
مشکل میں رات دن ہے یہ اُمت رسولؐ کی

خوش بخت خوش نصیب صحابہؓ ہیں کس قدر
دیکھی انہوں نے آنکھوں سے صورت رسولؐ کی

اُس کے لیے ہیں دونوں جہاں کتنے خوش نما
مل جائے آسیؔ جس کو محبت رسولؐ کی

عدیل احمد آسی/کوپن ہیگن ڈنمارک

مساء و صبح درودوں کے مشغلے رہیں گے
ہرآن زیست میں آقا کے تذکرے رہیں گے

رہے گا سلسلہ یونہی رواں اُجالوں کا
رواں مدینے کی گلیوں کو قافلے رہیں گے

یہ برگ و گل ہیں کسی گلشنِ حضوری کے
اسی لیے یہ ہمیشہ ہرے بھرے رہیں گے

شرف انہیں بھی عطا ہوگا مستجابی کا
درِ حبیبؐ پہ جو لفظ ان کہے رہیں گے

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

سلام

حسینؑ

صبا کا سینہ بنے سفینہ ذرا طبیعت رواں دواں ہو
ہوا میں خوشبو کے دائرے ہوں، خلا میں کرنوں کا سائباں ہو
زمیں زمرد اُگل رہی ہو، گلاب گلنار آسماں ہو
ہر ایک کونپل کنول اچھالے، کلی کلی کنج کن فکاں ہو
چمن کے سینے پہ فصلِ گل کا نشاں باندازِ کہکشاں ہو
جبین کونین پنجتن کے کرم سے فردوسِ انس و جاں ہو
کبھی سمندر ہوں میرے بس میں شجر شجر میرا رازداں ہو
درود کی انجمن سجاؤں، دہن میں جبریلؑ کی زباں ہو
خیال ہو سلسبیل جیسا، جلو میں لفظوں کا کارواں ہو
چمن سجاؤں میں اہل بیتؑ کا محبتوں سے بھرا جہاں ہو
کہیں قبیلہ ہو اولیاء کا، کہیں پہ بہلولؒ کی دکاں ہو
بچھا کے مسند بشارتوں کی دلوں پہ ادراک مہرباں ہو
میں اپنی سوچوں کو آب کوثر میں غسل دے دوں تو امتحاں ہو
پڑھوں میں تسبیح فاطمہؑ جب تو کعبہ فکر میں اذاں ہو
اگر یہ سب کچھ ملے تو مدحِ شہنشہِ مشرقین لکھوں
حیا کی تختی پہ اپنی پلکوں سے پھر میں لفظ حسینؑ لکھوں

محسن نقوی (مرحوم)

قدم تو میرے ہیں رستہ مگر حسینؑ کا ہے
کہ میری آنکھ میں روشن سفر حسینؑ کا ہے
زہے نصیب تو پتھر سے آبشار ہوئی
کرم یہ تجھ پہ میری چشمِ تر حسینؑ کا ہے
سگان دنیا نے تاراج کر دیا سر شام
اگرچہ سب کو خبر تھی یہ گھر حسینؑ کا ہے

یزیدِ عصر کی مدحت سرائی کیسے کروں
میرا قلم، میرا دست ہنر حسینؑ کا ہے
وفا کا خوں نہ کرو ساکنانِ شہر فریب
اسے نہ مارو کہ یہ نامہ بر حسینؑ کا ہے
رہے جو شانوں پہ سب مصلحت سے پست ہوئے
ہوا بلند جو نیزے پہ سر حسینؑ کا ہے
بچی ہے جس سے میرے خوں میں آتشِ انکار
زمانہ جانتا ہے وہ شرر حسینؑ کا ہے

ڈاکٹر جواز جعفری/لاہور

حسینؑ و منی کہا گیا تھا
طویل سجدہ کیا گیا تھا
نفوسِ خمسہ کی تھی ضرورت
مباہلہ سر پہ آ گیا تھا
خلیفۃ المسلمیں کی خوشیاں
غلام ان کو کہا گیا تھا
وفا کی تجدید ہو رہی تھی
چراغ گُل کر دیا گیا تھا
سپاہ ابنِ زیاد سے حُر
حسینی لشکر سے آ گیا تھا
بسا گیا دشتِ نینوا کو
وہ قافلہ جو چلا گیا تھا
صدا "الستُ بربکم" کی
جواب "قالو بلیٰ" گیا تھا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

ہوں شہریار مجھ پہ کرم ہے حسینؑ کا
اس دل کو کوئی غم ہے تو غم ہے حسینؑ کا
شہرت ہو جو آج میری قدم بوسیاں کرے
سارا دیا ہوا یہ بھرم ہے حسینؑ کا
جنت جسے کہیں وہ ریاست انہی کی ہے
عرشِ بریں و دیر و حرم ہے حسینؑ کا
راہب کو بھی یہ سات پسر بچپنے میں دے
کتنا بلند و بالا دھرم ہے حسینؑ کا
کر دے گا اور بھی یہ ترے مرتبے بلند
چھت پہ لگا ہوا جو علم ہے حسینؑ کا
کربل میں اپنے خون سے کی اس کی پرورش
اسلام کے بدن میں یہ دم ہے حسینؑ کا
پلکوں سے چومتا ہے تو خاکِ شفا اسد
تجھ پہ کرم ہی بول یہ کم ہے حسینؑ کا

اسد رضوی/پیرس

جرمنی میں مقیم ممتاز مذہبی سکالر اور خوبصورت شاعرہ
طاہرہ رباب الیاس
کا منفرد شعری مجموعہ
رزم گاہِ شعور
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
صفحات:160 قیمت: 500روپے
ناشر: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0300-4489310/0331-4489310

طنز و مزاح

بکروں کا نقطہ نظر!

عطاء الحق قاسمی/لاہور

میں نے بکروں کی خریداری کے لئے اجمل بو بکرے کو ساتھ لیا اور وحدت روڈ پر آ گیا۔ اجمل کی ساری عمر بکروں کے درمیان گزری ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس کا حلیہ اور وضع قطع بھی بکروں جیسا ہو گیا ہے بلکہ اس کے پاس بیٹھیں تو اس کے جسم حتیٰ کہ خیالات سے بھی بکروں کی بو آتی ہے جس کی وجہ سے دوستوں کے حلقے میں وہ اجمل بو بکرا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بکروں کی صحبت میں ایک طویل عرصے تک رہنے کی وجہ سے وہ ان کی زبان بھی سمجھنے لگا ہے بلکہ ان کی زبان اتنی روانی سے بولتا ہے کہ انسانوں کی زبان میں بات کرنا بھول گیا ہے۔ چنانچہ اگر اسے کبھی کسی انسان سے یا کسی انسان کو اس سے بات کرنا پڑے تو دونوں کو تفہیم میں بہت مشکل پیش آتی ہے، تاہم بڑی عید کے دنوں میں دوستوں کے حلقے میں اس کی بہت آؤ بھگت ہوتی ہے کیونکہ بکروں کی خریداری میں اس کی بکروں میں مقبولیت بہت کام آتی ہے۔

وحدت روڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بکرے قطار اندر قطار کھڑے تھے اور ان کے مالک گاہکوں سے بھاؤ تاؤ میں مشغول تھے، مختلف کونوں سے کھیرا ہے، آنڈو ہے، دانت ٹوٹا ہوا ہے، وغیرہ کی آوازیں آ رہی تھیں جس کا مقصد بکرے کی قیمت کم کرنا تھا اور ظاہر ہے یہ آوازیں گاہکوں کی تھیں۔ اجمل بو بکرے کو دیکھتے ہی کئی بکرے بڑی گرمجوشی سے اس کی طرف لپکے اور اس سے معانقہ کرنے کی کوشش کی مگر اجمل نے انہیں ان کی زبان میں کچھ کہا جس پر انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا غالباً یہی کہا ہوگا کہ میں اس وقت انسانوں کے ساتھ ہوں میری عزت کا معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ بے تکلفی چنداں مناسب نہیں، ایک بکرا جو معانقے میں کامیاب ہو گیا تھا، بہت بری سی شکل بنائے کھڑا تھا، غالباً اجمل بو بکرے کی بو نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

میں نے اجمل سے کہا کہ مجھے ہمیشہ سے یہ تجسس رہا ہے کہ جانور آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں، آج تم میرا یہ تجسس دور کرو، چنانچہ اجمل نے مجھے جو کچھ بتایا اس کے مطابق ایک بکرا دوسرے بکرے سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ موجودہ حکومت کی عمر دراز کرے، یہ ہم بکروں کی محسن ہے، صبح عید ہے مگر مہنگائی نے لوگوں کے کس بل نکال دیئے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اس دفعہ ہمیں صرف ٹٹولنے کا شوق پورا کر رہے ہیں، قیمتیں سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور منہ لٹکا کر آگے کو چل پڑتے ہیں۔ اس پر دوسرے بکرے نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو مگر تم نے نوٹ نہیں کیا، یہ انسان لوگ اپنی غربت چھپانے کے لئے جاتے وقت ہمارے بارے میں کیسی بری بری باتیں کرتے ہیں، صبح ایک گاہک آیا، وہ خود سنگل پسلی کا تھا، جب اس نے میری قیمت سنی تو کہنے لگا اس بٹیرے کے اتنے پیسے؟ میرا جی چاہا کہ اس کے پیٹ میں ٹڈھ ماروں تا کہ اسے پتہ چلے کہ بٹیرے اور بکرے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ ان بکروں کے پاس ہی ان کی ماں بھی بیٹھی تھی، اس نے ان کی گفتگو سنی تو بولی ”میں تمہاری کہاں تک خیر مناؤں گی، تم پاکستانی مسلمان کو نہیں جانتے، وہ اگر نہیں خریدے گا تو محلے میں اس کی ٹکے کی عزت نہیں رہے گی، اس نے کل کو اپنی بیٹی کی شادی بھی کرنا ہے، اس کی بیٹی کے لئے کون رشتہ لے کر آئے گا، جو عید کے روز بھی ہمسائے کے گھر سے گوشت کے آنے کے انتظار میں بیٹھا ہو؟“

یہ سن کر بکرے اداس ہو گئے، ان میں سے ایک نے اجمل بو بکرے کو مخاطب کیا اور کہا ”تم انسان اتنے خود غرض کیوں ہو کہ محض اپنی آن کے لئے ہماری جان کے درپے ہو جاتے ہو؟“

اجمل بو بکرے نے جواب دیا ”یہ بات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو، کسی انسان سے پوچھو“ مگر پھر اسے اچانک خیال آیا کہ وہ بھی لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنے بکرے ہونے کا اقرار کر گیا ہے چنانچہ اس نے فوراً کہا ”میرا مطلب ہے کہ میں تو تمہارا دوست ہوں، میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں، البتہ جو شخص میرے ساتھ تمہیں خریدنے آیا ہے، وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں سہمے ہوئے بکرے اگر اپنے دلوں کو خوف سے آزاد کر لیں تو کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ہر آنے والے کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں اور جھکی ہوئی گردن پر چھری نہ پھیری جائے تو کیا کیا جائے؟“

ان میں سے ایک بکرا کچھ سر پھرا لگتا تھا، اس نے گردن اوپر اٹھائی اور اجمل بو بکرے کو مخاطب کر کے کہا ”تمہارا دوست ٹھیک کہتا ہے، مگر تم نے اس معاملے میں اپنی رائے نہیں بتائی؟“ اجمل نے کہا ”میں اپنے اس دوست سے متفق نہیں ہوں، نہتے بکرے چھریوں والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے“

اس پر دوسرے بکرے نے اجمل کی طرف دیکھا اور کہا ”تم ٹھیک کہتے ہو، میں تمہارا ہم خیال ہوں“

مجھے یہ صلح جو بکرا پسند آیا، میں نے بیوپاری کو اس کی قیمت ادا کی اور گھر لے آیا، اس کی گردن میں خوبصورت گانی ڈالی اور پاؤں میں پازیبیں باندھیں، اسے عالی شان لنچ کرایا، داتا صاحب سلام کے لئے لے کر گیا اور پھر قصائی کو فون کیا کہ وہ صبح آٹھ بجے بکرا ذبح کرنے میرے گھر پہنچ جائے!

تہذیبی انسان کے آس پاس

یونس جاوید/لاہور

قتیل شفائی، آٹھ سے اسی سال تک کے لوگوں کا دوست تھا۔ شگفتہ، نفیس، رنگوں میں لپٹا، محبت میں بھیگا، مگر محبت کے لیے ترستا ہوا ترقی پسند شاعر...... ان سب سے مل کر ہی اس کی شاعری کا جھرنا پھوٹتا ہے، ساحر لدھیانوی کی طرح!...... یہی راستہ دونوں کی تکمیل کا راستہ تھا...... اور ہے...... قتیل شفائی سب کے لیے تھا...... مگر سب اُس کے لیے نہیں تھے۔ اس نے سب سہا، اور ایک دن ژاں پال سارتر کا جملہ دہرایا...... ''جہنم کے معنی ہیں دوسرے لوگ''، مگر قتیل کے نزدیک ''دوسروں لوگوں'' سے مراد صرف وہ لوگ جہنم کے ہم معنی تھے، جو دوسروں کے لیے اذیتیں بوئیں، دکھ کاشت کریں، عام آدمی کے لیے زندگی آزار بنائیں یا ان کے حقوق غصب کریں...... اسی باعث قتیل صاحب، اس جہنم کو بھی گل وگلزار بنا کر جیے...... مہکتے ہوئے...... چہکتے ہوئے...... مگر صرف اسی سال ...... ہمارے درمیان...... اور باقی اوجھل زندگی، جو لامتناہی ہے...... کوئی اس کا حساب جوڑ سکتا ہے نہ اس کا دعویٰ کرسکتا ہے اور جینوئن شاعر تو یوں بھی دنیا سے اٹھ جانے کے پچاس سال بعد اپنے اثرات دکھانا شروع کردیتا ہے۔ مگر وہ شاعر جو دوسروں کے لیے اس معاشرے کو زیادہ خوبصورت یا زیادہ قابلِ رہائش بنانے کے جتن میں جیتے ہیں...... قتیل کا شمار انہیں شاعروں میں ہونا چاہئے...... اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ قتیل جب خود اسی سال کے ہوئے اور مداحین نے انہیں اسی ہزار کی تھیلی پیش کرکے یقین دلا دیا کہ جناب آپ اسی کی سرحد کراس کررہے ہیں تو قتیل نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ شاید اس لیے کہ اسی سال سے اوپر کے بعض شاعروں کے لیے انہوں نے جو شعر کہہ رکھا تھا وہ آپ کو بھی یاد ہوگا۔

میرا دوست ہے، سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

مگر ان کی دوستی ہر عمر کے ایسے لوگوں سے تھی جو لفظ کی حرمت پر یقین رکھتے ہیں اور جو تخلیقی سفر میں ایثار سے لبالب ہیں یا اپنی ریاضت میں پرخلوص!

میں آٹھ کا تو نہیں سولہ سترہ کا ضرور تھا جب قتیل صاحب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں...... اُن دنوں مجھے شاعروں اور مشاعروں سے بے حد دلچسپی اس لیے تھی کہ ہمارے گھر میں ادبی کتاب، رسالے اور شعراء کا داخلہ ممنوع تھا بلکہ ان سب اشیاء کو لغویات کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ اس کاری ایکشن سمجھ لیں کہ میں پورنماشی کی راتوں میں چھت پر جاکر چاند روشنی میں شعرا کے مجموعے پڑھا کرتا اور سردیوں میں لحاف کے اندر ٹارچ جلا جلا کر فکشن۔

اُن دنوں یہ برعظیم پاک و ہند میں مشاعروں کی روایت تابندہ تھی...... اور خوب تھی اس سلسلے میں سب سے بڑا مشاعرہ کاٹن مل لائل پور میں ہوا کرتا تھا۔ یہ عظیم مشاعرہ لائل پور کاٹن مل کے مالک مرلی دھر صاحب جو خود بھی شاعر تھے...... منعقد کیا کرتے تھے...... پہلے پاکستان میں (لائل پور کاٹن مل میں) اور اس کے بعد بھارت میں کاٹن مل ہی کے تحت...... پاکستان میں ہوتا تو ہندوستان کے چنیدہ شاعر تشریف لاتے...... اور اگر ہندوستان میں ہوتا تو پاکستان کا ہر اہم شاعر دہلی جاکر داد، لفافہ اور کپڑوں کے تھان سمیٹ کر لوٹا کرتا...... اسی مشاعرے کی تڑپ میں میں بھی ایک مرتبہ ہمت کرکے ٹرین میں سوار ہوگیا اور لائل پور جا پہنچا۔ کاٹن مِل کے مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک دن عوام کے لیے کھلا مشاعرہ ہوتا۔ ایک دن ''اشرافیہ'' کے لیے مخصوص...... عام آدمی کا جس میں شامل ہونا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

میں پہلے دن ٹرین سے اتر کر کاٹن مل کا پتہ پوچھتا کاٹن مل آپہنچا۔ میرے ہاتھ میں ایک کتاب اور رات کو پہننے والا جوڑا پیک کیا ہوا تھا۔ ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں دیر تھی...... مگر افسوس کہ آج اشرافیہ کے لیے مخصوص مشاعرہ تھا جہاں چڑیا پر نہ مار سکتی تھی۔ مگر میں کسی طرح ہجوم کے ریلے میں شامل ہوتا ہوا تا اس جنگلے تک آپہنچا جس کے آہنی دروازے پر موٹے موٹے منتظمین کھڑے تھے۔ وہ کارڈ چیک کرتے ہوئے مہمانان کو خوش آمدید کہتے...... بعض کو سلیوٹ کرتے۔ میں بے چارہ سا، ہاتھ میں پکڑا سامان اُدھر سے اِدھر اِدھر سے اُدھر جھول رہا تھا...... کہ جنگلے سے تین گز اندر مجھے قتیل صاحب اپنے کسی مداح سے ملتے دکھائی دیے۔ یقین کیجئے...... قتیل صاحب سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی...... کبھی آمنا سامنا ہوا بھی تو ایک مجھ ایسا مرعوب شخص...... سلام کرنے کا حوصلہ بھی ہار جاتا ہے۔ سو میں دور ہی سے انہیں تکا کرتا تھا...... مگر آج کشتیاں جلا کر پہنچا تھا...... انہیں دیکھتے ہی خون جوش مار گیا...... میں نے دونوں ہاتھوں سے بھونپو بنا کر زور سے کہا...... ''قتیل صاحب...... قتیل صاحب''

''ارے''، قتیل صاحب چل کر خود گیٹ کی طرف آنے لگے...... کہ منتظمین نے بوکھلا کر میرے

لیے ادب سے دروازہ کھول دیا۔ اور میں ایک ہی جست میں قتیل صاحب کے روبرو تھا۔

"آج ہی پہنچے ہیں؟" انہوں نے یوں پوچھا جیسے مدت سے مجھے جانتے ہوں۔

"جی سر......ابھی۔"

"اور کون کون ساتھ ہے؟"

"میرزا ادیب بھی ہیں......عزیز اثری بھی مگر وہ دوستوں کو ملنے چلے گئے ہیں" میں نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ ان دو مکالموں کے درمیان قتیل صاحب مجھے گلے لگا چکے تھے اور بے حد شفقت سے خیریت دریافت کرتے جا رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک لمبے تڑنگے مداح نے قتیل صاحب کو جپھی ڈال لی......وہ دونوں قہقہوں میں بھیگ گئے تو میں موقع غنیمت جان کر ہجوم میں گم ہو گیا اور طنطنے اور طمطراق سے قالین پر بیٹھ کر ہر شاعر کو اتنے قریب سے دیکھتا اور سنتا رہا جو اس سے پہلے نصیب میں نہ ہوا تھا۔

حبیب جالب سے "ہم آوارہ" اسی مشاعرے میں پہلی مرتبہ میں نے سنی اور حفیظ جالندھری سے رقاصہ......اور "ابھی تو میں جوان ہوں" ساحر صدیقی......کا ترنم اللہ اللہ......صرف حبیب جالب اور قتیل صاحب انہیں رج کے داد دیتے ہوئے دیکھے گئے......باقی مترنم شاعر تحیر میں گم تھے۔

"تلاشِ دوست میں جب سے چلے ہیں
نہ شام آئی نہ سائے ہی ڈھلے ہیں"

اچھرہ کی ایک تنگ گلی میں درزی کا کام کر کے روزی روٹی کمانے والے ساحر نے جس قدر داد سمیٹی اس کا عشرِ عشیر بھی قدر افزا ہوتا تو وہ یوں بے حال نہ ہوتا...... وہ طفیل ہوشیار پوری کے دفتر میں ہیلپ بوائے بھی رہا اور شعر بھی کہتا رہا۔ طفیل صاحب جانتے تھے کہ معصوم لدھیانوی اور ساحر صدیقی باکمال لوگ ہیں مگر ایک کو کلر کی عطا کی دوسرے کو نائب قاصدی۔ اُن سے ایک زمانے میں، میں نے خود سنا کہ "میرے ترنم کی داد مجھے اختری بائی فیض آبادی نے دی ہے کہ یہ میرے ترنم سے میت ملتا ہے......" انہیں اپنے ترنم پر بہت ناز تھا مگر ساحر صدیقی کے ترنم کے بارے میں تبصرہ کم کرتے تھے۔ بہرحال......دکھ ہوا......کہ مری میں ایک مشاعرہ پڑھنے کے بعد کھانے سے فارغ ہوتے ہی ساحر صدیقی بیمار ہوا......اور مر گیا۔ کبھی کبھی حسن، عورت کے لیے دُکھ کیاری بو دیتا ہے کیا ترنم بھی یہی کچھ کرتا ہے اُن دنوں میں ماسٹر مدن کے بارے میں روایت کی طرح لوگ اول فول بکتے رہے مگر میں نہیں مانتا......کہ وہی تھا جو لوگ کہتے رہے بھوک کا مارا آدمی، کھانے پر ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا کرے گا، ہیضہ تو ہونا ہی تھا۔

قتیل صاحب سے محبت اور تعلق اس وجہ سے بھی تیزی سے بڑھنے لگا تھا کہ انہوں نے کبھی شجرہ پوچھا نہ میرٹ......وہ مجسم محبت تھے......باقاعدہ تقسیم کرتے تھے محبت وہ اپنے لاہور میں سیٹل ہونے کے واقعات بھی بے تکلفی سے کھلی ڈھلی زبان میں سنا دیا کرتے تھے کبھی اپنے حالات چھپائے نہ غربت نہ محصول چونگی کی ریاضت۔ یہی باتیں انہیں ارفع بنا دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے کھل کر مجھے بتایا کہ جب میں لاہور میں ایک کمرے میں رہ رہا تھا......کہ ایک روز میری عدم موجودگی میں آگ بھڑک اٹھی......اور سب کچھ جل گیا۔ میں نے جوں توں سامان تو جمع کر لیا مگر کڑی زبردست تھی کسی طرح یہ خبر چودھری برکت علی تک جا پہنچی جہاں میں ادب لطیف کا نائب مدیر بھی تھا۔ تیسرے روز میں نے دیکھا کہ اپنے شاندار رئیسی تانگے پر بیٹھے چودھری برکت علی چلے آ رہے ہیں۔ نوکر کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا جگ اٹھوا رکھا ہے انہوں نے آتے ہی گلے لگا کر افسوس کا اظہار کیا اور ایک لفافہ میری جیب میں اڑس کر کہا......"یہ قرض نہیں......ایڈوانس ہے......شعری مجموعے کے لیے" ان کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا......تو دو سو پچاس روپے کے نوٹ تھے ۱۹۴۸......۴۹ میں آج کے حساب سے بیس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔ یہ واقعہ سناتے ہوئے قتیل صاحب کی آنکھیں نم تھیں۔ کہنے لگے "محبت کا کوئی کیا جواب دے سکتا ہے" چودھری برکت علی جو ادب لطیف کے مالک تھے مکتبہ اردو اور پنجاب بک ڈپو کے بھی مالک تھے۔ انہوں نے ایک عرصے تک دودھ بھرا جگ نوکر کے ہاتھ بھجوایا۔ اس باقاعدگی سے اور بروقت کہ ملازم کی دستک سے ہی مجھے معلوم ہو جاتا کہ صبح کے سات بج چکے ہیں۔ ان کی یہ ادا اور محبت کا اظہار ممتا کے جذبات سے لبالب دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں آج بھی ان جذبات کو محسوس کرتا ہوں بلکہ زیادہ درست ہوگا اگر کہا جائے کہ "میں آج بھی خود کو ان کا مقروض تصور کرتا ہوں۔" قتیل صاحب کی آنکھیں ایسے موقعوں پر نم ہو جاتی تھیں۔ یہی ان کی سچائی تھی۔ احسان شناسی کے بوجھ سے لدا رہنے والا ہی اس سچائی کا حامل ہو سکتا ہے۔ ورنہ حضرت علیؓ کے فرمان کے مطابق "جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو" "باون تولے پاؤ رتی" درست ہے مگر احسان شناس لوگ لاکھوں میں خواہ ایک ہی سہی مگر ان کا وجود تو ہے نا۔

قتیل صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے سے بہت جونیئر یا کمتر لوگوں سے برابری کی سطح پر ملا کرتے۔ خوش آمدید کہنے کا منفرد انداز، تپاک سے گلے لگاتے......کوئی اور موجود ہوتا تو اسے ملواتے ہوئے بڑی عزت افزائی کے ساتھ کہا کرتے......"یہ

میرے دوست ہیں، یونس جاوید صاحب'' یہ انداز بالکل سید عابد علی عابد صاحب کی طرح کا تھا......جو مجھے متعارف کراتے ہوئے کہا کرتے تھے ''میرے رفیقِ کار یونس جاوید صاحب'' حالانکہ میں میٹرک کرتے ہی ایک مجبوری کے تحت مجلس ترقی ادب میں نیا نیا ملازم ہوا تھا اور وہ بھی ایڈیٹنگ سیکشن میں، جبکہ عابد صاحب کی حیثیت نہ صرف مجلس میں سینئر ایڈیٹر کی تھی بلکہ وہ ادبی دنیا کے قطب مینار کہلاتے تھے۔ دیال سنگھ کالج کی پرنسپل شپ سے ریٹائر ہو کر مجلس میں آئے تھے۔ بڑے معروف شاعر مستند نقاد، فکشن رائٹر، فلم نگار، ڈرامہ نویس اور معلوم نہیں کیا کیا تھے۔ مگر ان کی عظمت اور بڑا پن ہی یہ تھا کہ شاخِ ثمر دار کی طرح پیار سے جھک کر ملا کرتے......میلا رام وفا کے شعر سناتے بھی......سمجھاتے بھی۔ اپنا شعر کبھی نہ سنایا مگر میں سناتا ہوں ۔

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

بعد میں ایک کرید کے نتیجے میں انہوں نے مجھے بے حد توقیر دیتے ہوئے بتایا تھا کہ میں نے تمہاری ایک کہانی ''دھرتی کے گھاؤ'' پڑھی ہے۔ بہت خوب لگی......زبان بھی پسند آئی......خصوصی طور پر ''پانی کے ذرات'' جھونپڑی کے اندر تک آگئے۔''......والا جملہ......'' عابد علی عابد صاحب کی اس تعریف سے میں گنگ ہو گیا۔ اور بہت دونوں تک رہا۔ یہی حال قتیل صاحب کا تھا۔ کسی کا شعر پسند آ جاتا تو کئی جگہ سناتے، کہانی پسند آتی تو بار بار ذکر کرتے۔ ایک مرتبہ وہ انڈیا میں تھے۔ یہ بات 86-1985 کی ہے۔ میرا طویل دورانیے کا ڈراما ''رگوں میں اندھیرا'' PTV سے دو مرتبہ چلنے کے بعد شالیمار ریکارڈنگ کمپنی کی طرف سے اس کا ویڈیو بھی ریلیز ہو چکا تھا اور برصغیر پاک۔ و ہند میں اس کے چرچے تھے پاکستان میں میں اس پر فلم بھی لکھ رہا تھا۔ سو اس پس منظر میں وہ ہندوستان گئے وہاں مہتہ نامی ایک خاتون فلم ڈائریکٹر کو انہوں نے ایک جگہ ''رگوں میں اندھیرا'' وی سی آر پر چلا کر اس کے بعض حصوں کو محظوظ کرتے دیکھا معلوم ہوا اس کہانی پر بھارت میں وہ فلم بنانا چاہ رہی ہیں۔ قتیل صاحب نے بہ آواز بلند کہا ''یونس سے پوچھا ہے آپ نے؟'' جواب میں سب لوگ مسکرانے لگے۔ مگر قتیل صاحب مطمئن نہ ہوئے انہوں نے بہت دلائل کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ اول تو یونس جاوید سے اجازت لیں، اسے معاوضہ دیں......اور اگر کچھ نہ دینا چاہیں تو اس سے پوچھ کر فلم پر اس کا نام ہی دے دیں'' فلم تو بنی مگر ایسا نہیں ہوا ہوگا......اسی طرح ''وادی پُر خار'' تو مجھے خود'' کے خورشید'' نے آکر بتایا تھا......کہ میں اس کی ویڈیو اپنے بیٹوں کو دے آیا ہوں کہ صرف گانے اس میں ڈال لیں۔ باقی بہت کچھ ہے......'' قتیل صاحب نے بھی ہندوستان سے واپس آکر بہت سے ایسے قصے سنائے تھے اور اسی خاطر وہ بھارت جا کر وہاں کے موسیقاروں کے لیے گیت لکھتے بھی تھے......اور بعض پرانے گیتوں کو بھی ری مکس کروا کر ٹھیک ٹھاک معاوضہ لیا کرتے......اور کہتے ''اس سے پہلے کہ وہ قبضہ کر لیں میں خود کیوں نہ بیچ لوں'' یہ بات سو فیصد درست تھی۔

بھارت والوں نے ہمارے گیتوں، دھنوں اور ڈراموں کو بعینہٖ فلما کر تہمتیں ہم پر لگائیں۔ اس پر ایک پوری ڈاکومینٹری پاکستانی چینل پر چلائی بھی گئی تھی۔ جس سے ان کا سارا بھرم کھل گیا تھا۔ بہر حال پاکستان رائٹرز گلڈ کا الیکشن تھا اور قتیل جب سیکرٹری شپ کے لیے دوبارہ امیدوار تھے۔ ظاہر ہے سیکرٹری ہونے کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ اس کے لیے پوری مجلس عاملہ کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ عاملہ میں جس کے ووٹ زیادہ ہوں گے وہی سیکرٹری منتخب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بہت جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ قتیل صاحب اس سلسلے میں سخت مصروف تھے اور دوستوں سے مل ملا رہے تھے۔ ایک روز میں بھی ان کے ساتھ تھا قتیل صاحب کے پاس کار تو تھی نہیں وہ ہمیشہ رکشے پر سفر کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ہم لوگ کہیں پیدل کبھی رکشے میں اِدھر اُدھر جاتے رہے۔ شام کے پانچ بجے میں نے دیکھا قتیل صاحب اس کام سے بور ہو چکے ہیں ہم شادمان کے قریب سے گزرے تو قتیل صاحب نے رکشے والے سے کہا ''روک لو......روک لو......بس یہیں'' بریک چرچرائی، کرایہ ادا ہوا، بالکل سامنے کو کوٹھی پہ بیل بجا کر ہم اندر آن پہنچے۔

ڈرائنگ روم میں ایک فربہ خاتون جانماز بچھا کر نماز پڑھ رہی تھی وہیں ایک صوفے پر نہایت دبلا پتلا سمارٹ وائٹ ہیر مدبر شخص بیٹھا تھا جو اٹھ کر ہمیں ملا......اور بیٹھ گیا۔ ایک منگول ٹائپ مونچھوں والا نوجوان شلوار قمیص میں اندر آیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔ خاتون نے نماز ختم کی۔ قتیل صاحب سے سلام دعا ہوئی۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ خاتون ماضی کی کوئی بڑی ہیروئن ہیں مگر مجھے نام معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وائٹ ہیئر شخص سے ملواتے ہوئے قتیل صاحب نے جھٹ سے مجھے کہا ''یہ ولی صاحب ہیں۔ (ان کا نام ہی ولی صاحب تھا) ''گڈا گڈی'' تو آپ نے دیکھی ہوگی؟'' واقعی میں نے یہ فلم دیکھ رکھی تھی......اور اس کے دو گیت جو بہت ہٹ تھے وہ بھی سن رکھے تھے۔ 1۔ نہیں ریساں شہر لہور دیاں۔ 2۔ چن نال پیار کرن دا بندیا ایہوای نتیجہ ہندا اے، دوسرے گیت نے تو شکور بیدل کو بھی ہٹ کرا دیا تھا۔ جو بھارت کے عظیم موسیقار اور ایک زمانے تک سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے میوزک ڈائریکٹر خیام کے بھائی تھے......مگر ہٹ ولی صاحب کے ساتھ مل کر

ہوئے...... خاتون سے متعارف کراتے ہوئے قتیل صاحب نے مجھے بتایا "یہ ممتاز شانتی ہیں ولی صاحب کی بیگم اور فلم پگلی کی ہیروئن۔ اور یہ، انہوں نے منگول مونچھوں والے بے ربط نوجوان...... کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ دونوں کا بیٹا ہے۔ ممتاز شانتی نے گفتگو شروع کی۔ گفتگو نہ تھی...... گلہ مندی تھی، دکھ تھا۔ بلکہ بعد میں مجھے یوں لگا کہ ایک فریاد سی ہے جس کی کوئی لے تھی نہ اس میں بناوٹ تھی نہ اداکاری۔ وہ بولی "قتیل صاحب...... آپ تو جانتے ہیں ہم نے بڑی عزت کمائی، شہرت سے جھولیاں بھریں، قدر افزائی سے جیبیں...... اور دولت کا کیا حساب کروں...... مگر قتیل صاحب...... جب ہم بمبے سے لاہور آئے تو ہمارے دوستوں نے ہمیں پہچان نہ دی۔"

قتیل صاحب نے بات کاٹ کر کہا "نہیں...... نہیں...... آپ کا نقش بہت گہرا ہے۔ آپ کو کون نہیں جانتا...... لوگوں کو ابھی تک "بسنت" یاد ہے۔ "پگلی" یاد ہے۔ قتیل صاحب نے اور بھی بہت سی فلموں کے نام گنوائے تھے جو مجھے یاد نہیں رہے مگر وہ دکھ رونے پر مُصر تھیں۔ کہنے لگیں "سُنیں سُنیں قتیل صاحب...... میں انارکلی گئی تھی...... پرسوں۔ وہاں "دول ہاؤس" میں شاپنگ کے لیے داخل ہوئی تو سامنے...... نئی ہیروئن کھڑی تھی (انہوں نے ہیروئن کا نام لیا تھا جو میں بوجوہ نہیں لکھ رہا) میں نے سوچا ایک ہی انگلش سکول کی پڑھی ہوئی ہیروئن ہے۔ اسے دیکھ کر میں خوشی سے کھل گئی اور بڑے زعم اور تپاک سے اُس کی طرف بڑھی میں اس سے ملنا چاہتی تھی، بڑے گداز سے بڑی محبت سے، میں مسکرائی...... تو وہ ایک قدم یوں پیچھے ہٹ گئی جیسے میرے ہاتھ میں سانپ لٹکا ہو۔ میں نے شیک ہینڈ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید؟"

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی" اس نے کھٹاک سے پتھر مار دیا۔ میں نے اپنے زعم کو دوگنا کرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا "میں ممتاز شانتی ہوں۔" وہ بولی "سوری...... میں نہیں جانتی۔" میں نے ڈھیٹ بن کر کہا آپ نے پگلی کا نام تو سنا ہوگا؟"

"Who is she?" تڑاک سے اس نے جواب نہ دیا تھا۔ ایک تھپڑ مارا تھا۔ "بسنت" کا نام بھی نہیں سنا؟" میں ہار نہ ماننا چاہ رہی تھی۔ اس نے نفی میں زور سے سر ہلایا...... جواب دینے کی ضرورت بھی نہ تھی...... ایک موٹی عورت نے اس کا بازو کھینچ کر کہا "چل چھڈ وی دے ہن" وہ دونوں دکان کے دوسرے حصے میں چلی گئیں تھیں۔ قتیل صاحب سچ پوچھیں تو زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے موت کو سرسراتے اور اپنے وجود سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ میری جان، پاؤں تک چلی گئی ہو جیسے۔ میں نے نم آنکھوں کو چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ یقین کریں۔ یہ اداکاری نہ تھی۔ مجھے دکھ یہ تھا کہ میں نے کیوں خود کو گرایا؟ کیوں پیار بانٹنے کو آگے بڑھی۔ بھرم کھو دیا۔ خفت اٹھائی۔ اس قدر بے توقیری، جس کا دوسرا سرا ذلت کے گڑھے میں جا گرا تھا۔ میں روہانسی ہوگئی تھی، آخر یہی تو ہمارا کلچر تھا۔ محبت تھی، یگانگت تھی اور اسی کی کھوج میں بھارت میں اپنا سب کچھ چھوڑ چلی آئی تھی۔ قتیل صاحب میں مٹی مٹی ہو چکی تھی۔ بکھری بکھری اور بے نام۔ مجھے سوال سنپولیوں کی طرح ڈستے تھے۔

"کیا میرا پاکستان آنے کا فیصلہ درست نہ تھا؟"

"کیا شوبز کے انداز الٹ پلٹ ہو چکے ہیں؟"

"کیا ہماری جڑ اس زمین میں لگ سکے گی؟"

"کیا ہماری شناخت، عزت اور احترام پھر سے ہمیں مل سکے گا؟" بس قتیل صاحب...... یہی الجھنیں مجھے جینے نہیں دے رہیں۔ دن رات سانس رکتا ہے۔ تنہائی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے آپ تشریف لائے اور میں دل کھول سکی۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ پس منظر میں ممتاز شانتی کی ایک آدھ سسکاری بھی ماحول کو سوگوار بنا رہی تھی۔ یہ کیسا ماحول تھا انا کی کرچیاں تھیں جو چاروں سمت پھیل گئی تھیں درمیان میں ہوکے کی جھنجھناہٹ تھی۔ اگر کہا جائے کہ گھٹی ہوئی، ضبط کی ہوئی چیخ کی یہی صورت انسان کے اندر تیزاب کی پھوار بن کر اسے ہلکان کر دیتی ہے تو یہ سچ ہے۔ یہ تو بعد میں کھلا کہ انا کے چکنا چور ہو جانے پر چہرا کتنے رنگ بدلتا ہے۔ جو میں محسوس کر رہا تھا۔ قتیل صاحب مجھ سے کہیں زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سرخی تھی۔ سارا خون آ جمع ہوا تھا۔ مگر قتیل صاحب نے ممتاز شانتی کی سلیقے سے دلجوئی کی...... اور جن الفاظ میں کی...... معلوم ہوتا کہ کبھی مضمون لکھنا پڑے گا تو میں نوٹس لے لیتا۔ مگر میں تو تحیر کے ایسے حصار میں تھا جس میں پل پل نئے انکشافات حیرت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ولی صاحب بڑے حوصلہ مند نکلے...... سارا عرصہ مسکراتے رہے آخر میں کھل کر ہنسے اور کہا "Sensitive (سینسٹیو) ہونے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ آدمی خود کو گھن کی طرح کھاتا ہے، زندگی کو انجوائے کرنے کے بجائے عذاب جھیلتا ہے۔ خون جلاتا ہے۔ ایسا آدمی، نئے معاشروں میں جی نہیں سکتا ممتاز" ممتاز نے انگلی اور انگوٹھے سے آنکھوں کو دبایا...... نمی نچوڑی اور اٹھ کر چائے کی نگرانی کو چلی گئی۔

ولی صاحب نے قتیل صاحب سے کچھ ایسی باتیں کیں جن کا پس منظر مجھے سمجھ نہ آیا لیکن آہستہ آہستہ پرتیں کھلنے لگیں پہلے بمبے کی باتیں شروع ہوئیں...... پھر سٹوڈیو کی دیواروں کے پیچھے کی پراسرار

کہانیاں، مشترکہ دوستوں کے قصے، اداکاروں کے عشق، ساحر لدھیانوی کا عروج، عشق اور نظمیں...... مگر جب ولی صاحب نے سعادت حسن منٹو کا نام لیا تو میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا...... قتیل صاحب کی آنکھیں زیادہ چمکنے لگیں۔ بالکل ساحر کے ذکر پر جس طرح چمکی تھیں۔ وہ گہری دلچسپی سے ولی صاحب کی طرف تکنے لگے اور میں تو مسلسل ولی صاحب کو گھورے جارہا تھا کہ وہ منٹو کے بارے میں کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ جسے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا...... ملتا کیسے......

ولی صاحب نے آنکھوں پر پڑی سفید پلکوں کی جھالر کو کئی مرتبہ جھپکایا پھر سفید ابروؤں پر انگوٹھے اور انگلیوں سے جیسے استری کر دی۔ اور پھر دور خلاؤں میں تکتے ہوئے کچھ دیر منظر کو (Recall) ری کال کرتے رہے میں مسلسل انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ مجھے اتنے ہی خوبصورت اور سویٹ لگ رہے تھے جس قدر میری پسندیدہ شخصیات اپنے سفید بالوں کے باعث خوبصورت اور منفرد لگتے تھے۔ اور ہر کسی کے لیے پرکشش تھے ان میں شوکت حسین رضوی، منیر نیازی، اے حمید اور سید ضیا جالندھری اور اب ان میں ولی صاحب کا اضافہ ہو چکا تھا۔ (ایک بات بعد میں مجھے معلوم ہوئی تھی کہ سید ضیا جالندھری کی قلمیں سفید تھیں اور اوپر والے بال سیاہ تھے اور وہ جوانی میں بھی اپنی قلموں کو سفید خضاب سے سفید رکھتے تھے کہ ان پر بہت جچتی تھیں)

ولی صاحب نے کہنا شروع کیا ''منٹو بلا کا متحرک تھا۔ لکھنے میں بھی...... سوچ میں بھی...... اس کا ذہن اس کے قلم سے دس گنا آگے دوڑتا تھا...... بعض طویل ترین کہانیاں اس نے ایک ہی نشست میں لکھیں تھیں اور ہر روز بھی۔ (یہ بات سچ ہوگی مجھے انجم رومانی صاحب نے بتایا تھا کہ منٹو صاحب نے ''موذیل'' پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر کے ساتھ والی میز پر بیٹھ کر لکھی تھی...... کرسی پر پاؤں کے بل بیٹھ کر پنسل سے...... اور ایک ہی دن میں...... جو ان کی طویل ترین اور اعلیٰ ترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔)

ولی صاحب نے کہا ''منٹو عملی طور پر بھی معاشرتی زندگی میں بہت فعال تھا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا...... مجھ سے دوستی تھی...... مگر لین دین نہ تھا تاہم ایک روز جب میں سونے کی تیاری میں تھا...... رات بھیگ چکی تھی منٹو بغیر اطلاع دیئے وارد ہوا۔ اور مضطرب انداز میں بولا تین سو روپے چاہئیں...... فوراً۔

بمبے کی فلمی دنیا میں ثقافتی رکھ رکھاؤ اپنی جگہ، منٹو کی قدر اور عزت بھی مسلّم مگر اچانک آدھی رات کے بعد اس طرح اتنی بڑی رقم کا تقاضا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ ولی صاحب نے اپنی بات بڑھانے سے پہلے وضاحت کی ''اتنی بڑی رقم اس لیے کہا میں نے...... کہ 1940-42 میں یہ پچیس ہزار سے کم نہ تھی۔ میں نے لمحے بھر کو سوچا تو منٹو نے پتھریلے چہرے سے سنجیدہ ہو کر زور سے کہا ''انکار نہ کرنا...... لاؤ''

منٹو نے اس طرح کبھی نہ کہا تھا...... بمبے کی ان دنوں کی زندگی میں وہ کئی دوسرے لکھاریوں سے زیادہ خوشحال تھا۔ شراب بھی آسانی سے انہیں میسر تھی۔ جو اس وقت بھی مناسب مقدار میں اس نے پی رکھی تھی...... مجھے خیال ہوا کہ اسے زیادہ شراب کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی...... اور اس وقت؟ میں نے توقف کیا تو منٹو پھٹ پڑا ''ولی...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی کرو'' ایک طرف اتنی بڑی رقم اور دوسری طرف منٹو کی بے چینی...... میں نے سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور الماری سے روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ منٹو جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے نکل گیا بغیر کسی رسمی شکریے کے تکلف کے، میں مخمصے میں تھا...... وسوسے مجھے درپیش تھے، جوا وہ کھیلتا نہ تھا...... شراب اس نے پی رکھی تھی۔ کوئی پریشانی بھی بظاہر نہ جھلکتی تھی۔ مجھے یہی بات ڈستی تھی کہ رات کے سوا بارہ بجے جب تاریخ بدل چکی ہے، موسم ٹھنڈا یخ ہے، کس مصیبت نے اسے آن گھیرا؟ کہ وہ اتنی بڑی رقم کے لیے بے چینی سے میرے پاس آیا۔ میرا تجسس منٹو کے بچوں کے بارے میں تھا یا بھابی صفیہ کے بارے میں...... خدا خیر کرے...... منٹو نے کچھ بھی تو نہ بتایا تھا۔ میں نے فوراً چتی کو بلایا جو میرا خاص ملازم اور بھروسے کا آدمی تھا۔ بڑا کائیاں اور دردمند۔ میں نے چتی کو ساری بات سمجھا دی اور کہا کہ منٹو صاحب کا پیچھا کر کے ساری بات معلوم کرے...... کہ گھر میں خیریت ہے کوئی مشکل کوئی مصیبت تو نہیں...... مگر یہ بھی تاکید کی...... کہ جس قدر ممکن ہو جلدی لوٹ آئے۔ کیونکہ اس کی اطلاع سے پہلے میں سو نہ سکوں گا۔ اور یہ بھی کہا کہ منٹو صاحب کی نگاہ سے بچ کر رہنا ہوگا۔ انہیں معلوم نہ ہو کہ تم پیچھا کر رہے ہو۔

چتی...... گز گز بھر کا قدم اٹھا کر لپک کر منٹو کے پیچھے نکل گیا...... مجھے پورا یقین تھا کہ چتی نے منٹو کو جا لیا ہوگا۔ میں ٹہل ٹہل کر وقت کاٹنے لگا...... دو بج گئے بے قراری بڑھنے لگی چتی نہ لوٹا تھا۔ مجھے منٹو کے لیے زیادہ فکرمندی نے گھیر لیا تھا۔ میں نے دعا کی۔ منٹو کے لیے اس کے بچوں کے لیے، بھابی کے لیے اچانک بیل ہوئی...... چتی آ گیا تھا...... وہ آتے ہی ہانپنے ہونکنے لگا۔

بولا...... ''مروادیا صاحب......''

''کیا ہوا؟...... حاشیہ مت چڑھاؤ سیدھی بات کرو۔

چتی کہنے لگا...... ''صاحب کھودا پہاڑ نکلا چتی۔''

''پھر وہی بات'' مجھے غصہ آ رہا تھا۔ وہ بولا ''صاحب...... میں صاحب کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ

بہت تیز چلتا ہے صاحب بھیے کے سارے بازار پھرا گھما کر وہ تنگ گلیوں میں نکل گیا...... جہاں ایک سے ایک کھولی ہے صاحب۔ میں پیچھے پیچھے تھا۔ قسمت اچھی تھی۔ صاحب نے مڑ کر نہ دیکھا...... بس سیدھا چلتا چلا گیا...... بہت دیر بعد جہاں بالکل ہی اندھیرا گھپ تھا۔ ایک کھولی کا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر مانٹو صاحب اندر چلا گیا جب...... مگر میں سکڑا دبکتا رہا اتنی سخت سردی میں بھی سامنے فرش پر بچھے ٹاٹ پر کوئی بیمار عورت لیٹی تھی۔ پاس تیل کا دیا رکھا تھا۔ صاحب سیدھا اس کے پاس گیا۔ اسے ایک نظر دیکھا اور کھانے پینے کا سامان کے ساتھ سارے نوٹ بھی نکال کر اس کے گندے بستر پر رکھ دیے...... اور واپس مڑ آیا...... میں فوراً دیوار کی طرف منہ کر کے موری پر بیٹھ گیا صاحب، جب مانٹو صاحب نکل گیا تو آیا ہوں...... مگر سچی بات یہی ہے صاحب کہ کھودا پہاڑا اور نکلا چنی......"

ولی صاحب مسکرائے اور منٹو کی شخصیت پر انہوں نے بہت کچھ اور بھی کہا اور یہ بھی بتایا کہ منٹو تیسرے دن دوپہر کے بعد میرے دفتر آیا اور نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "ویل ڈن" اور نکل گیا۔ اسی اثناء میں چائے سرد ہو چکی تھی مگر میری دلچسپی زیادہ تر ولی صاحب کی باتوں سے بندھی تھی۔ قتیل صاحب دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اٹھ آئے مگر مجھے ولی صاحب سے دوبارہ ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہو سکا۔ البتہ ایک دن ادبِ لطیف کے دفتر میں پہنچا تو چودھری برکت علی مرحوم کا بیٹا ظفر (آج کل ادب لطیف کی مدیرہ صدیقہ بیگم کا بھائی) میرے ہی انتظار میں تھا...... چھوٹتے ہی بولا......

"قتیل صاحب...... ملنا ہے...... میرے ساتھ چلو......" میں تھکا ماندہ پہنچا تھا...... مگر قتیل صاحب کا نام سن کر فوراً تیار ہو گیا...... ہم پیدل چل رہے...... راستے میں سواریوں والے ایک تانگے میں ظفر سوار ہو گیا اور مجھے بھی کھینچ لیا...... تانگہ میکلوڈ روڈ کے چوراہے میں رکا تو سب ہی اتر گئے۔ ظفر اور میں بھی اترے اور پیدل مارچ شروع کیا۔ لکشمی چوک پہنچے۔ ظفر ان تمام فلمی دفاتر میں جاتا اور قتیل صاحب کے بارے میں معلوم کرتا...... سب نے یہی بتایا کہ "ابھی ابھی نکلے ہیں" یا "آنے والے ہیں" اسی دوران میں ظفر نے مجھے بتایا کہ وہ قتیل صاحب سے ان کے مجموعے (شاید) ہریالی، کا نیا کنٹریکٹ سائن کرانا چاہتا ہے جسے مکتبہ اردو نے پہلے بھی شائع کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے کنٹریکٹ کا فارم بھی دکھایا اور نوٹ بھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ ایک پبلشر قتیل صاحب کو رائلٹی ادا کرنے جا رہا ہے۔ بہت دفتروں کی سیڑھیاں چڑھنے اترنے کے بعد ہمیں قتیل صاحب مل گئے...... وہ بہت خوش تھے...... دونوں سے اٹھ کر ملے۔ چائے کے لیے ملازم کو آواز دی...... مگر ظفر نے کہا "نہیں جلدی ہے۔"

پوچھا...... "کیسے آئے؟"

ظفر نے جیب سے چھپا ہوا کنٹریکٹ نکالا...... اور سامنے رکھ کر بولا "اس پر آپ کے دستخط چاہئیں۔"

کنٹریکٹ سامنے رکھے قتیل صاحب اداس ہو کر سوچنے لگے...... پھر آنکھیں جھپک کر یادوں کو تازہ کیا اور کہا "مجھے چودھری برکت علی صاحب یاد آ رہے ہیں" انہوں نے اپنا سارا قصہ دہرایا...... جس میں دو سو روپوں کا لفافہ اسی ترتیب سے موجود تھا پھر اپنی بے سرو سامانی کے اُن لمحوں کو اجاگر کر کے کہنے لگے "ایسے لوگ ہی معاشرے کو خوب صورت بناتے ہیں میرے دل اور دماغ پر چودھری صاحب کی شرافت اور حسن سلوک کا نقش اس قدر گہرا ہے کہ خود میری شخصیت کی تعمیر میں اس نکتے کا بڑا دخل ہے۔" انہوں نے قلم کھولا اور کنٹریکٹ فارم پر دستخط کر کے کنٹریکٹ ظفر کی طرف بڑھا دیا۔ اور نم آنکھوں سے کہنے لگے "میں ان کی محبت کا قرض تو ادا نہیں کر سکتا مگر تم جب چاہو...... کتاب چھاپ لیا کرو...... حساب اور دستخط بعد میں ہوتے رہیں گے" حیرت سے ظفر نے کنٹریکٹ جیب میں رکھا اور اسی جیب میں پڑے سو سو کے پانچ نوٹ بھی اندر ہی محفوظ کر لیے جنہیں وہ قتیل صاحب کو دینے آیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ قتیل صاحب کو پاؤں سے ہلا جلا کر یہ اطلاع دوں کہ روپے ظفر کی جیب میں پڑے ہیں پیسے وصول کر لیں مگر قتیل صاحب کا استغنا اور احسان شناسی میرے سامنے دیوار بن گئی تھی۔ میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ کاش وہ اپنے پبلشر سے اپنی رائلٹی اپنا حق وصول کر لیتے...... جس کے لیے میں نے بھی تگ و دو کی تھی مگر ہر پبلشر کی طرح ظفر بھی لگی تھا۔ اسرار زیدی کے خاکے میں میں نے لکھا تھا کہ ظفر، رحمان صدیقی (خطاط) کو روپے دینے میرے ساتھ گیا اور اس سے ناراض ہونے لگا کہ کام لیٹ کر دیا ہے اُس نے...... وہ شریف آدمی گردن جھکا کر کھڑا رہا اور ظفر روپے جیب میں لیے واپس آ گیا۔ یہی بات میرے دل میں اس وقت بھی بوجھ تھی...... آج قتیل کے معاملے میں یہ بوجھ دگنا ہو گیا تھا۔

لیکن تخلیق کار کی اصل تو یہی ہے نا...... کہ وہ احسان کا بوجھ برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ وہ قربانی اور ایثار اور محبت سے مل کر غنی بنتا ہے۔ اس کا شرمیلا پن اس کا زیور ہے جو اسے جائز مفادات سے بھی گریز پا بنا کر چنیدہ اور ارفع بنا دیتا ہے۔ اور قتیل صحیح معنوں میں تخلیقی شاعر تو تھے ہی، تہذیبی انسان بھی تھے جن کا سارا خمیر دوست نوازی، چاہت اور وفا شاعری سے خلق ہوا تھا۔

ایڈورڈ سعید: دانش ور کے اظہارات

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر / لاہور

دانش ور کے اظہارات، ایڈورڈ ڈبلیو سعید کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ انھیں ۱۹۹۳ میں بی بی سی ریڈیو پر ریتھ خطبات کے طور پر پیش کیا گیا تھا (بی بی سی نے اپنے پہلے ڈائریکٹر جنرل لارڈ جان ریتھ کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۴۸ میں ریتھ خطبات کا آغاز کیا تھا۔ اوّلین خطبات کے لیے برٹرینڈ رسل کو دعوت دی گئی تھی۔ ان کے علاوہ آرنلڈ ٹائن بی، ایڈورڈ لیچ، جان سرل، وول سوئنکا جیسے معروف مفکرین یہ خطبات پیش کر چکے ہیں)۔ ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵-۲۰۰۳) فلسطینی نژاد امریکی دانش ور تھے، یعنی دوہری شہریت کے حامل تھے۔ دوہری شہریت، دوہرے تناظر کو ممکن بناتی ہے۔ وطن اور جلاوطنی کا تناظر۔ یہ دوہرا تناظر ہمیں سعید کے نظامِ فکر کی بنیاد میں کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ عالمی تنقید میں جسے سعید کا اہم اضافہ کہا جا سکتا ہے، اسے مابعد نوآبادیاتی تنقید کا نام ملا ہے۔ نوآبادیاتی مغرب نے کس طور مشرق، اسلام اور افریقا کے 'علم' کو طاقت کے حصول کا ذریعہ بنایا؛ مشرق اور مغرب، یا 'ہم' اور 'وہ' کی تفریق قائم کی، جس میں 'ہم' کو 'وہ' پر فوقیت حاصل رہتی ہے، نیز 'ہم' ایک ایسے مرتبے کا حامل رہتا ہے، جہاں سے اسے 'وہ' کی من مانی ترجمانی کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ مابعد نوآبادتی تنقید کا یہ بنیادی تصور، سعید کے دوہرے تناظر کا مرہون ہے۔ وہ ایک ایسے امریکی عالم تھے، جن کی روح ایک وطن پرست فلسطینی باشندے کی تھی۔ سعید کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی وطن پرستی کو ایک جبلی جذبے تک محدود نہیں ہونے دیا، بلکہ اسے ایک استعارہ بنایا۔ (اگر وہ ایسا نہ کرتے تو غالباً آزادیِ فلسطین کے ہتھیار بند مجاہد ہوتے)۔ پھیلاؤ، استعارے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ چناں چہ سعید 'نوآبادیاتی تدبیروں، سازشوں سے تارتار وطن کے تجربے' کو مشرق و ایشیا میں استعماری حربوں کی تفہیم کا استعارہ بناتے ہیں۔ لہٰذا ان کی آواز فقط ایک فلسطینی عرب کی نہیں رہ جاتی، مشرق و افریقا کی آواز بن جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ تفہیم اور اس کے اظہار کے لیے 'مغرب' کے علم اور زبان کو بروے کار لاتے ہیں۔ انھوں نے 'وہ' کا استغاثہ مغرب کے علم اور مغرب کی زبان میں پیش کیا ہے۔ ان سب باتوں کی بازگشت ان خطبات میں بھی شدت سے سنائی دیتی ہے۔

خطبات کے پیش لفظ میں سعید نے انگریزوں کے اس ردِّعمل کا ذکر کیا ہے، جو ۱۹۹۲ میں ان کے خطبات کے اعلان کے فوراً بعد ہوا۔ اس ردِّعمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعید کی 'فلسطینی امریکی شناخت' میں فلسطینی عنصر ہی کو برطانوی صحافیوں نے توجہ دی، اور اس حوالے سے طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ انھیں فلسطینیوں کے حقوق کی جنگ میں فعال ہونے کا الزام دیا گیا، اور اس بنیاد پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ وہ کسی معتبر پلیٹ فارم پر گفتگو کرنے کے لیے موزوں نہیں۔ بعض نے تو انھیں طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ [ہر تحریر، خطبے میں] اپنے سوانح کو پیش کرتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب تھا کہ انھیں ایک فلسطینی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ سنڈے ٹیلی گراف میں انھیں 'مغرب مخالف'' قرار دیا گیا، اور کہا گیا کہ ان کی تمام تحریریں مغرب کو الزام دینے پر مرکوز ہیں، جن میں تیسری دنیا کی تمام برائیوں کا ذمہ دار مغرب کو قرار دیا گیا ہے۔ ایک صحافی نے تو دانش ور کے اظہارات کو موضوع بنانے کو غیر انگریزانہ (Un-English) کہا۔ اس تنقید کے جواب میں سعید نے لکھا ہے کہ ''یہ بڑی حد تک دانش ور کے سلسلے میں برطانوی رویوں کو منکشف کرتی ہے''۔ سعید سماجی رویوں کو فطری نہیں، ایک تشکیل سمجھتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ یہ رویے صحافیوں کے ذریعے برطانوی عوام کو ملے ہیں، مگر ان کی تکرار انھیں موجودہ سماجی استناد دیتی ہے۔ گویا جسے برطانوی صحافیوں نے غیر انگریزانہ کہا، وہ انگریزی تہذیب کا کوئی بنیادی عنصر نہیں، بلکہ برطانوی عوام کا وہ رویہ ہے، جسے ذرائع ابلاغ کی مقتدر شخصیتوں نے پیدا کیا ہے۔ سعید عوام اور رائے ساز مقتدر شخصیتوں کے اس رشتے کا تجزیہ نہیں کرتے، جس میں عوام مجہول انداز میں، کسی تنقیدی شعور کے بغیر آرا کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سعید کی فکر کا محور اقتداری سیاست ہے، جس میں رائے کی تشکیل سے لے کر اس کے اظہار تک کے تمام اختیارات ایک ہی طبقے میں مرتکز ہوتے ہیں۔ سعید اسی طبقے کی حکمت عملیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اسی رو میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ برطانوی صحافی اور عوام مشرق و مغرب کی اسطور (متھ) کے اسیر ہیں۔ سعید کی نظر میں مشرق و مغرب، فکشن ہیں؛ یہ ایسی ''اساطیری تجریدات'' ہیں جو جھوٹ پر مبنی ہیں۔ یعنی مغرب نے اس تفریق کے ذریعے جن باتوں کی بنیاد پر مغرب کو مشرق سے مختلف قرار دیا، وہ باتیں حقیقتاً مشرق میں موجود ہی

نہیں؛ جیسے مشرق کو مذہب کا،اور مغرب کو سائنس و عقلیت کا علم بردار سمجھنا،اور مشرق کی تاریخ میں موجود سائنس و عقلیت پسندی کے واقعات کو مشرق کی اسطور کی تشکیل کرتے ہوئے خارج کرنا۔سعید نے اپنی کتابوں شرق شناسی(۱۹۷۸)اور ثقافت اور استعماریت (۱۹۹۳)میں ان موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے۔خطبات کے پیش لفظ میں وہ اس امر کا گلہ کرتے ہیں کہ انھوں نے ان کتابوں میں جو کچھ لکھا،انھیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ،ان پر تنقید کی گئی۔سعید نے ثقافت اور استعماریت میں جین آسٹن کے ناول *Mansfiled Park* میں جہاں انٹیگوا(ویسٹ انڈیز کا جزیرہ)میں غلامی اور برطانوی ملکیت کے علاقوں میں گنے کی کاشت سے متعلق کچھ نہ کچھ موجود ہے۔جو کچھ آسٹن نے لکھا ہے،کیا وہی کچھ اس کے قارئین سمجھتے ہیں؟ سعید کی شکایت یہ ہے کہ جین آسٹن پر [برطانوی]لوگوں کی توجہ ہے،مگر اس کے قارئین کو خارج رکھا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں آسٹن پر ان کی تنقید کو نہیں پرکھا گیا۔

سعید برطانوی صحافیوں کے لیے کہیں دانش ور کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دانش ور کا تصور ایک ایسے شخص کے طور پر کرتے ہیں جس کی عوامی کارکردگی کی نہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے،نہ اس کی کارکردگی کو کسی نعرے، راسخ العقیدگی، پارٹی لائن یا عقیدے(ڈوگما)میں بدلا جاسکتا ہے۔دانش ور اپنی جماعتی وابستگی ، قومی پس منظر ، مذہبی وفاداری کے باوجود انسانی بدحالی سے متعلق سچائی کے کڑے معیار سے جڑا رہتا ہے۔جب کہ برطانوی (ہمارے یہاں کے بھی) صحافی قومی پس منظر اور ادارہ جاتی ، مذہبی ، نظریاتی وفاداریوں کے پابند نظر آتے ہیں؛ ایسے لوگوں کے خیالات کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔سعید یہ رائے قائم کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ دانش ور سچائی کے کڑے معیار کی پابندی کے باوجود اس راسخ العقیدگی کا شکار نہیں ہوتا،جس کی پیش گوئی کی جاسکتی ہو۔اس کے یہاں لازماً تشکیک کا عنصر ہوتا ہے جو اسے مسلسل سوال اٹھانے پر مجبور رکھتا ہے۔حقیقی دانش ور سچائی کے کڑے معیار کا بھی وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہتا ہے۔سعید نے دانش ور کے اس تصور پر آگے بھی اظہار خیال کیا ہے،لہٰذا مزید بحث آگے آرہی ہے۔

سعید کے ضمن میں برطانوی ذرائع ابلاغ کا رویہ 'شناختوں کی سیاست' کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔کسی سماج میں کسی مفکر کے افکار میں سے کس پہلو یا کسی تخلیق کار سے متعلق کس رائے کو اہمیت ملتی ہے؟ایک مفکر یا تخلیق کار کے یہاں عموماً تنوع ہوتا ہے ،(کیوں کہ اگر کوئی تخلیق کار ایک ہی خیال کی مسلسل رٹ لگائے تو اس کی تخلیقیت ہی مشکوک ہوجاتی ہے)مگر اس کے کسی خاص پہلو کو منتخب کرلیا جاتا اور اسے اس کی واحد شناخت ٹھہرادیا جاتا ہے۔جیسے ٹیگور کی ہندوستانی تخلیق کار کی شناخت اور اقبال کی امت مسلمہ کے شاعر کی شناخت۔چناں چہ ٹیگور کے یہاں ہندوستانی ثقافتی روح کی تلاش کو مرکزی اہمیت دی جاتی اور اقبال کے یہاں امت مسلمہ کی ترجمانی کو۔ان دو موضوعات کے علاوہ جو کچھ ہے،اسے یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے،یا ان کی من مرضی کی تعبیریں کی جانے لگتی ہیں۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیات اپنی مخصوص شناختوں کے ساتھ دو کینن ، دو عظیم دیوتا بن جاتے ہیں،جن کی تقدیس کی حفاظت کا ذمہ بعض بزرجمہر لے لیتے ہیں۔بحث و گفتگو کا کھلا آزادانہ ماحول ،جس سے دانش وری کو فروغ ملتا ہے،اسے دیوتا پرستی اور حفظِ تقدیس محال بنا دیتے ہیں۔شخصیات کے علاوہ بعض نظریات،آئیڈیالوجیوں کو بھی جب سماج اپنی اٹل شناخت بنالیتے ،اور انھیں دیوتا کا مرتبہ تفویض کردیتے ہیں تو دانش وروں کے 'مختلف ،متبادل،یا متوازی' نظریات کے اظہار تک کو محال بنادیا جاتا ہے۔(ملازمت سے برخاستگی ،کفر کے فتوے، معاشی ،جنسی بدعنوانی کے الزامات تو معمولی باتیں ہیں؛قتل سے بھی گریز نہیں کیا جاتا)۔جس صورت حال کا سامنا سعید کو برطانیہ میں نسبتاً کم مشکل انداز میں کرنا پڑا،اس کی شدید صورتیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔تاہم 'شناختوں کی سیاست' کا کھیل جمہوری ملکوں ،اور پاکستان جیسے نام نہاد جمہوری ملکوں میں کھیلا جاتا ہے۔

سعید نے پیش لفظ میں اپنے خطبات کے بیش تر نکات کو دہرایا ہے،لہٰذا ان پر بحث تو آگے کی جائے گی،تاہم ایک اور نکتہ ایسا ہے جسے انھوں نے خطبات میں پیش نہیں کیا،صرف پیش لفظ میں اس پر مختصر گفتگو کی ہے۔اس کا ذکر ضروری ہے۔جب کوئی دانش ور بے اختیار ہو،مگر افسوس ناک حالات کا سامنا کررہا ہو تو کیا کرے؟ سعید اس کے جواب میں میشل فوکو کے ان تھک تبحر علمی(relentless erudition) کا تصور پیش کرتے ہیں،جس کے تحت مدفون دستاویزات ،فراموش شدہ ،یا ترک کردہ تاریخوں کو کھنگالا جاتا ہے۔یہ اظہار کے متبادل ذرائع ثابت ہوتے ہیں۔گویا دانش ور کو کبھی خاموش نہیں ہونا چاہیے۔اگر وہ اپنے عصر سے متعلق راست اظہار کے سلسلے میں بے بس ہو،موت کے خطرے سے دوچار ہو تو اظہار کا متبادل ذریعہ اختیار کرے۔اپنے اظہار پر مسلط خاموشی کا توڑ ،تاریخ کی خاموش دستاویزات میں تلاش کرے۔تاہم یہ اظہار کا متبادل ذریعہ اس وقت بن سکتا ہے،جب یہ حال کی درشتی سے گھبرا کر

ماضی میں پناہ لینے کا وسیلہ نہ بنے؛ خطرے کا سامنے سے مقابلہ کرنے کی بجائے، اوٹ میں جا کر خطرے سے نبرد آزما ہونے کی تدبیر بنے۔ اگر مدفون دستاویزات پر تحقیق، معاصر عہد کے سلگتے ہوئے سوالات یا کم از کم بنیادی نوعیت کے انسانی سوالات سے لاتعلق رہے تو یہ ساری تحقیق ایک بے رس اکیڈمک سرگرمی بن کر رہ جاتی ہے۔ اردو کی ماضی کی دستاویزات سے متعلق تحقیق کا المیہ یہی ہے کہ یہ متبادل دانش ورانہ اظہار نہیں ہے۔ تاہم جدید اردو فکشن نے اس رمز کو پالیا تھا۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا فکشن خصوصاً فراموش کردہ ماضی کی 'خاموشی' میں اپنے لیے اظہار کے نئے، متبادل اسالیب کی دریافت کرتا ہے؛ داستانی، اساطیری بیانیوں کی علامتیت کو سطحی حقیقت پسندی کا متبادل بنا کر پیش کرتا ہے۔

سعید نے چھ خطبات دیے۔ پہلا خطبہ 'دانش ور کے اظہارات' کے عنوان سے ہے، جسے کتاب کا عنوان بھی بنایا گیا ہے۔

پہلے خطبے کا آغاز سعید اس سوال سے کرتے ہیں کہ کیا دانش ور، اعلیٰ طرز پر منتخب لوگوں کا، ایک چھوٹا یا بڑا گروہ ہے؟ دانش ور سے متعلق یہ بنیادی سوال نہیں۔ دانش ور کون ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے۔ اس سوال کے دو جواب اٹلی کے انتونیو گرامشی (۱۸۹۱۔۱۹۳۷) اور فرانس کے ژولیاں بندا (۱۸۶۷۔۱۹۵۶) نے دیے۔ اطالوی مارکسی، سیاسی فلسفی گرامشی (جسے مسولینی نے ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۷ قید میں رکھا) نے 'جیل کی ڈائری' میں لکھا کہ تمام آدمی دانش ور ہیں مگر تمام لوگ دانش وری کا فریضہ ادا نہیں کرتے، جب کہ ژولیاں بندا نے دانش ور کو فیض یافتہ فلسفی بادشاہوں کا قلیل گروہ قرار دیا جو انسانیت کے ضمیر کی تشکیل کرتے ہیں۔ سعید اپنی بحث کا مدار ان دو مختلف آرا پر رکھتے ہیں جو بڑی حد تک توقع کے خلاف ہے۔ افتتاحی خطبے میں وہ دانش ور سے متعلق نظری بحث نہیں کرتے، جس کی توقع ان کی دیگر تحریروں کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ (مثلاً : *Beginnings: Intention and Method* میں وہ 'اصل' کی فلسفیانہ جہت سے بحث کرتے ہیں، یا شرق شناسی میں شرق شناسی کے ڈسکورس پر نظری بحث کرتے ہیں)۔ دانش ور پر نظری بحث کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ دانش ہے کیا چیز، اور اسے حاصل کیسے کیا جاتا ہے؟ ایک انٹیلکچوئل کے پاس علم ہوتا ہے، یا حکمت و دانش؟ بادی النظر میں تو انٹیلکچوئل کے پاس intellect ہے، دانش (wisdom) نہیں۔ ہمارے یہاں حکیم کا لفظ صاحب حکمت کے معنوں میں رائج رہا ہے؛ لفظ دانش ور کا استعمال انٹیلکچوئل کے معنی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ دانش ور کے رواج نے 'حکیم' کے لفظ کو روزمرہ کی لغت سے خارج ہی کر دیا۔ البتہ طب یونانی کے ماہر کو حکیم کہنے کا رواج اب بھی ہے۔

بعض اوقات حکمت و دانش کو محض علم کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے حکمتِ فرنگ، یا دانش فرنگ۔ بہ قول اقبال: خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ/ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف؛ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے/ وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو۔ تاہم ان دونوں 'اصطلاحوں' میں معانی کا فرق موجود ہے۔ نور اللغات کے مطابق ''اصطلاح میں حکمت عبارت ہے، احوال موجودات کے علم سے جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہے''۔ موضوع کے اعتبار سے حکمت کی تین شاخیں بیان کی گئی ہیں: طبعی، ریاضی اور الہیٰ۔ حکمت کو نظری اور عملی میں بانٹا گیا ہے۔ اس طور حکمت بڑی حد تک فلسفہ و سائنس کا مفہوم رکھتی ہے۔ جب کہ دانش کا مفہوم، عقل، فہم، دانائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکمت کی اصطلاح ان کلاسیکی مشرقی علوم کے لیے مستعمل تھی، جنھیں خاص طریق کار کے تحت حاصل کیا جاتا تھا، جب کہ دانش، عام زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والا 'علم' تھا، اس لیے دانش کا دائرہ وسیع تھا؛ دانشمند اس شخص کو کہا جاتا تھا، جو زندگی کے مقصد و منتہا سے متعلق ایک ایسی بصیرت رکھتا ہو، جسے اس نے گزران وقت کے ساتھ، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد، اور زندگی کی اونچ نیچ کے متنوع تجربات کے بعد حاصل کیا ہو۔ ویبسٹر ڈکشنری میں wisdom کا مفہوم اس سے ملتا جلتا ہے: وہ علم جسے زندگی سے متعلق کئی تجربات کے بعد حاصل کیا گیا ہو۔ زندگی کے متنوع تجربات سے متعلق ہونے کی بنا پر، یہ علم اخلاقی جہت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اخلاقی جرأت و دیانت کا تقاضا دانشمند سے لازماً کیا جاتا ہے، جب کہ کسی خاص علم کے متخصص سے عموماً۔ ہر چند دانشمند کا یہ قدیم تصور ہے، اور اس کی جگہ دانش ور کے نئے تصور نے لے لی ہے، جو زندگی کے محض تجربات پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ باقاعدہ تحقیق سے کام لیتا ہے، مگر اخلاقی اقدار کے پاس دار ہونے کا مفہوم اب بھی اس سے وابستہ ہے۔ مثلاً دانش وری کا انحصار سچائی کی دریافت اور اظہار پر ہے، یہ دونوں اخلاقی جرأت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

گرامشی اور بندا کی دانش ور کی تعریفوں کے تجزیے کے دوران میں اور اس کے نتیجے میں، سعید اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہیں۔ گرامشی دانش کو کسی ایک طبقے کا خصوصی استحقاق نہیں سمجھتے۔ ایک مارکسی مفکر کے طور پر وہ دانش کے سلسلے میں طبقاتی تفریق کے

قائل نہیں۔گرامشی کے مطابق ہر آدمی کے پاس فہم و خرد کی صلاحیت ہے جسے وہ استعمال کرتا ہے،تاہم ہر شخص سماج میں دانش ور کا فریضہ (Function) ادا نہیں کرتا۔سعید گرامشی کی اس رائے کا تجزیہ نہیں کرتے ،جس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وہ اسے درست تسلیم کرتے ہیں۔سعید یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ کیا دانش ور کا انحصار کلی فہم کی اسی صلاحیت پر ہے جسے تمام لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں بروئے کار لاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب،ہاں میں دینے سے ،ایک بڑا سوال ہمارے سامنے منھ پھاڑے کھڑا نظر آتا ہے۔اگر تمام لوگ دانش ور ہیں تو پھر'تمام لوگ' مقتدر طبقوں کی آرا کو مجہول انداز میں کیوں قبول کر لیتے ہیں؟ حکمران طبقوں کے نظریات ،ان کے ذہنوں پر کیوں غلبہ پا لیتے ،اور ان کی نظروں سے معاشی ،فکری ،ثقافتی استحصال کی ظاہر و مخفی صورتوں کو کیوں اوجھل کر ڈالتے ہیں؟ اینگلز کے لفظوں میں لوگ اس 'باطل شعور' کا شکار کیوں ہوتے ہیں جو انھیں سرمایہ داریت کی قبیح صورتوں کو پہچاننے اور پھر انھیں مسترد کرنے کے ناقابل بنا دیتا ہے؟ خود گرامشی کا اجارہ داری کا نظریہ کہتا ہے کہ پولیٹیکل سوسائٹی کے نظریات ،میڈیا، جامعات اور ثقافتی اوضاع کے ذریعے سول سوسائٹی پر اجارہ حاصل کر لیتے ہیں۔اصل یہ ہے کہ جہاں تک دانش ور کو عوام سے الگ ،ممتاز سماجی گروہ قرار دینے کا تعلق ہے،تو اسے ہم گرامشی کے لفظوں میں جھوٹا (اسطور) کہہ سکتے ہیں ہیں، کیوں کہ اس سے ایک طرف مخصوص علم کے سلسلے میں مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم کرنے کا شائبہ ہوتا ہے،اور دوسری طرف عوام اور دانش ور میں فاصلے کی وہی دیوار اٹھانے کی 'حکمت عملی' نظر آتی ہے، جو بادشاہوں ،نو آبادیاتی آقاؤں اور غلاموں کے بیچ کھڑی کی جاتی ہے،تا کہ بادشاہ اور آقا کی ہر بات فرمان سمجھی جائے۔لیکن جہاں تک ہر شخص کے دانش ور ہونے کا سوال ہے تو گرامشی کی دلیل بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ چوں کہ تمام لوگ کوئی ایک زبان بولتے ہیں،اور شاعری زبان ہی میں ہوتی ہے،اس لیے تمام لوگ شاعر ہیں۔قصہ یہ ہے کہ جس طرح شاعری میں زبان کا خاص استعمال (استعاراتی) ہوتا ہے ،اسی طرح دانش وری میں بھی فہم و خرد کی صلاحیت خاص انداز (یعنی سوال اٹھانے ،واضح رائے قائم کرنے اور اس کا بے خوف اظہار کرنے) میں بروئے کار آتی ہے۔بلاشبہ فہم و ادراک کی صلاحیت پر کسی ایک طبقاتی یا صنفی گروہ کا اجارہ نہیں،مگر محض اس صلاحیت کی موجودگی کسی کو دانش ور ثابت نہیں کرتی۔

یہاں ہمیں ابن رشد کا خیال آتا ہے۔انھوں نے لوگوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا تھا۔''پہلا جو سب سے بڑا ہے،ان لوگوں کا ہے جو منبر پر سے دیے جانے والے وعظ سن سن کر مذہبی عقائد پر ایمان رکھنے لگتے ہیں۔خطابت کے زور سے ان کو جس طرف بھی چاہیے موڑا جا سکتا ہے۔یہ سادہ ذہن راسخ العقیدہ لوگوں کا طبقہ ہے۔[اسی طبقے سے خودکش بمبار پیدا ہوتے ہیں۔ن ع ن] دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے ،جن کی مذہب کے بارے میں جو سمجھ بوجھ ہے،اس کا دارومدار کچھ تو استدلال پر ہے لیکن زیادہ تر ان مقدمات پر جن کو بے چوں و چرا مان کر استدلال آگے بڑھتا ہے۔یہ طبقہ مدرسی علما اور متکلمین کا ہے۔تیسرا اور آخری طبقہ جو ان سب سے چھوٹا اور مختصر ہے،اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو مذہب کی عقلی سمجھ بوجھ رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ان کے عقائد کی بنیاد ان مقدمات پر ہوتی ہے جن کا بہت اچھے طریقے سے تجزیہ کیا جا چکا ہوتا ہے،اور وہ ثابت ہو چکے ہوتے ہیں''۔(محمد کاظم،مسلم فکر و فلسفہ ،ص ۲۵۹)۔تیسرے طبقے کو ابن رشد فلاسفہ کہتے ہیں،اور آج کی اصطلاح میں ہم انھیں دانش ور کہہ سکتے ہیں۔فلاسفہ کی طرح دانش وروں کا طبقہ بھی مختصر ہوتا ہے۔اس لیے نہیں کہ یہ طبقہ خصوصی طور پر فیض یافتہ ہے ، بلکہ اس لیے کہ مذہبی مقدمات یا سماجی و ثقافتی روشوں کا عقلی تجزیہ کرنے کے لیے جس محنت، ارتکاز توجہ ،مشکل سوالات اٹھانے کی ضرورت ہے،اکثر لوگ اپنی طبعی کاہلی یا مصلحت پسندی کی وجہ سے،اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔

سعید گرامشی کی رائے کے دوسرے حصے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں،جس میں کہا گیا ہے کہ دو قسم کے لوگ دانش وری کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔روایتی دانش ور اور تنظیمی (جن کے لیے گرامشی Organic کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں) دانش ور۔سعید گرامشی کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ ''روایتی دانش وروں میں اساتذہ، پادری اور وہ منتظمین ہیں جو نسل در نسل ایک ہی کام کیے چلے جاتے ہیں، (ابن رشد کی وضاحت کی رو سے یہ لوگ عوام ہی کا ایک طبقہ ہیں، دانش ور نہیں) جب کہ تنظیمی دانش ور طبقات یا تنظیم سے براہ راست وابستہ ہو کر زیادہ طاقت اور زیادہ اختیار حاصل کرتے ہیں۔سرمایہ دار اور تاجر اپنے ساتھ صنعتی ماہرین ،سیاسی معیشت کے متخصصین ، نئے کلچر اور نئے قانونی نظام کے منتظمین تخلیق کرتا ہے''۔سعید کے نزدیک گرامشی نے سرمایہ دارانہ کلچر میں دانش ور کے کردار کی صحیح تشخیص کر لی تھی،مگر بندا نے دانش ور کا قدامت پسندانہ تصور پیش کیا ہے۔

بندا نے اپنی کتاب دانش وروں کی غداری (۱۹۲۷) میں ان دانش وروں پر سخت تنقید کی تھی جنھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک نہیں کہا

اوراصولوں پر سمجھوتے کیے۔بندا کے پیشِ نظر دانش ور کا جو پروٹوٹائپ تھا،قدیم تاریخ میں اس کی مثال سقراط اور حضرت عیسیٰؑ تھے ،اور تمام اہلِ کلیسا جو حضرت عیسیٰؑ کی وراثت کے محافظ تھے،نیز بندا کی نظر میں اہلِ کلیسا سچائی اور انصاف کے ابدی معیارات کے علم بردار ہیں۔بندا، دانش ور کے مذہبی پروٹوٹائپ میں سقراط کے علاوہ کچھ فلسفیوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں، جیسے سپائی نوزا، وولٹیئر، ارنسٹ ریناں اور نطشے۔ ریناں نے نپولین کے تشدد کی مذمت کی اور نطشے نے فرانس پر جرمنوں کی بربریت کے خلاف آواز اٹھائی۔بندا مزید کہتے ہیں کہ ’’اصل دانش ور وہ ہے جس کی سرگرمی بنیادی طور پر عملی مقاصد کے تابع نہیں ہوتی۔وہ اپنی مسرت آرٹ، سائنس یا مابعد الطبیعیاتی غوروفکر میں تلاش کرتا ہے‘‘ اور یہ اعلان کرتا ہے کہ ’’یہ دنیا میری مملکت نہیں‘‘۔ بندا کے مطابق حقیقی دانش ورجلاوطنی یا صلیب پر چڑھنے کے لیے تیار رہتا ہے ۔بندا افسوس سے کہتے ہیں کہ آج کے دانش ور کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس نے فرقہ واریت، عوامی احساسات، قومی جنگوں ،طبقاتی مفادات کے آگے اپنی اخلاقی طاقت کو ہار دیا ہے۔اسے بندا دانش ور کی غداری سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔سعید کا خیال ہے کہ بندا پہلی عالمی جنگ اور ڈریفس افیئر (جس کا آغاز ۱۸۹۴ میں فرانسیسی فوجی، مذہباً یہودی الفریڈ ڈریفس پر جرمنوں کو فرانس کے عسکری راز فراہم کرنے سے متعلق غداری کے الزامات سے ہوا، جس میں اسے سزا ملی) کی روحانی تشکیل تھا۔ان دونوں واقعات نے فرانسیسی دانش وروں کو کٹھن آزمائش سے دوچار کیا؛ان کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ وہ سامی مخالف رویوں ،عسکری ناانصافی اور قومی جوش کے خلاف جرأت سے بولیں؛دوسرا راستہ یہ تھا کہ بزدلانہ طور پر ہجوم کا ساتھ دیں، یہودی الفریڈ ڈریفس کے دفاع سے انکار کرتے ہوئے، جرمنوں کے خلاف جنگجویانہ ترانے گائیں۔

سعید یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ بندا کا دانش ور کا تصور قدامت پسندانہ ہے، مگر یہ طاقت کے خلاف سخت گونج دار لے میں اپنا اظہار کرتا ہے، اور اس کی نظر میں کوئی دنیوی طاقت ایسی نہیں، جس پر تنقید نہ کی جاسکتی ہو اور جس کا محاسبہ نہ کیا جا سکتا ہو۔’روایتی دانش ور‘ بڑی سے بڑی دنیوی طاقت کے آگے بے باکانہ کلمہء حق کہنے کی جرأت کہاں سے کشید کرتا ہے؟ بندا کے یہاں اس سوال کا بالواسطہ جواب موجود ہے۔’روایتی دانش ور‘ اپنی سرگرمی کو غیر مادی، مابعد الطبیعیاتی اغراض سے وابستہ کرتا ہے؛ اس کی نظر اس دنیا کے بجائے اُس دنیا پر ہوتی ہے، اس لیے اس دنیا کی ترغیب اور خوف اُس پر غالب نہیں آتے۔سعید، بندا کے دانش ور کی بے خوفی کی تعریف کرنے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتے۔ان کا پہلا اعتراض فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔بہ قول سعید، بندا سچائی اور انصاف کے جن ابدی معیارات کو دانش ور کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں، وہ اِس ،ہماری دنیا کے نہیں ہیں، نیز یہ واضح نہیں ہوتا کہ ابدی اصولوں کی بصیرت کیوں کر حاصل ہوتی ہے۔سعید کو دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بندا کے زمانے میں عوامی ذرائع ابلاغ (ماس میڈیا) موجود نہیں تھے، اس لیے وہ براڈ کاسٹر، کمپیوٹر تجزیہ کار، کھیلوں اور میڈیا کے آئینی ماہرین، پالیسی ماہرین، حکومتی مشیروں، خصوصی مارکیٹ رپورٹ کے متخصصین جیسے دانش وروں کے سماج میں کردار کا اندازہ نہیں کر سکے۔گرامشی نے جنھیں تنظیمی دانش ور کہا ہے، مذکورہ ماہرین انھی کی قسمیں ہیں۔لہٰذا سعید کی نظر میں گرامشی کا دانش ور کا تصور حقیقت پسندانہ ہے۔

گرامشی کے تصور کو حقیقت پسندانہ قرار دینے کے پس منظر میں، سعید کا اپنا ترجیحاتی تصور کائنات بھی کارفرما ہے۔سعید مذہبی تصورِ کائنات پر سیکولر تصورِ کائنات کو ترجیح دیتے ہیں۔سعید کا سیکولر تصورِ کائنات بڑی حد تک اطالوی مفکر گیامبتستا وکو (۱۶۶۸۔۱۷۴۴) کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ انسانی دنیا ہے، اسے انسانوں نے اپنے ارادوں سے تشکیل دیا ہے، اور سماجی دنیا کا ہر رویہ، ادارہ، رواج ،نظریہ تاریخ کے محور پر تشکیل پایا اور اس سارے عمل میں فطرت یا الوہی قوتوں کا ہاتھ نہیں۔ انسانی سماج میں الوہی قوتیں مداخلت نہیں کرتیں۔جو لوگ تاریخ کے عمل میں الوہی کردار کا نظریہ پیش کرتے ہیں، وہ دراصل اپنی حکم رانی کا جواز گھڑتے ہیں۔چناں چہ اس دنیا کو ہم الوہی قوانین کی مدد سے نہیں، فہم کے سیکولر انسانی طریقوں سے سمجھ سکتے ہیں۔ظاہر ہے اس تصور کائنات میں بندا کے روایتی دانش ور کی جگہ نہیں۔

سعید، گرامشی کے دانش ور کے تصور کو حقیقت پسندانہ سمجھنے کے باوجود، اسے کافی نہیں سمجھتے۔ وہ امریکی ماہر عمرانیات الوِن گولڈنر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں دانش ور نے امرا کے طبقے کی جگہ لے لی ہے (کیوں کہ صنعتی معاشرے میں علم کی صنعت کو حقیقی پیداوار کی صنعت پر برتری حاصل ہوگئی ہے، اور اوّل الذکر صنعت سے وابستہ افراد کافی مالدار ہوگئے ہیں)، مگر وہ وسیع عوام کو مخاطب نہیں کرتے۔وہ مخصوص زبان میں محدود لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں، اور وہی ان کی زبان سمجھتے ہیں۔وہ فوکو کی یہ رائے بھی درج کرتے ہیں کہ ’آفاقی دانش ور‘ (جیسے سارتر) کی جگہ ’خصوصی دانش ور‘ نے لے لی ہے۔سعید ان خطبات میں ان خصوصی یا تنظیمی دانش

وروں کو جگہ جگہ سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

دانش ور سے متعلق خود سعید اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں دانش ور ایک ایسا فرد ہے جسے عوام کے لیے کسی پیغام، نقطۂ نظر، رویے، فلسفے، رائے کی نمائندگی، تجسیم اور تشکیل کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ وہ مشکل سوالات اٹھاتا ہے۔ راسخ العقیدگی اور عقیدے (ڈاگما) کا مقابلہ کرتا ہے، نہ کہ انھیں پیدا کرتا ہے۔ دانش ور کی وجہ جواز تمام لوگوں کے ان تمام مسائل کی نمائندگی ہے، جنھیں فراموش کر دیا گیا یا چھپا دیا گیا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے خیال کی تشکیل اور ترسیل کو بہ یک وقت اہمیت دیتے ہیں۔ 'خیال کی تشکیل' کا یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ دانش ور کسی راسخ العقیدہ نظریے یا آئیڈیالوجی کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ معاصر دنیا کی مختلف روشوں پر سوال اٹھاتا، یا فراموش شدہ مسائل و معاملات کی چھان پھٹک کرتا ہے، اور پھر اسی عمل کے دوران میں 'خیال کی تشکیل' کرتا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے آفاقی (اخلاقی) اصولوں کی پابندی تو ضروری قرار دیتے ہیں، مگر کسی راسخ العقیدہ نظریے کی نہیں۔ خیال کی تشکیل ہی سے اس کی ترسیل کا سوال جڑا ہے۔ سعید کے مطابق دانش ور کو ایک ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے، جو نہ صرف خود دانش ور کی مخصوص آواز کا نمائندہ ہو (جیسے برٹرینڈ رسل یا سارتر)، بلکہ عوام کے لیے قابل فہم بھی ہو۔ سعید یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ کیا خیال کی تشکیل کا عمل خود ہی اپنے اسلوب کا تعین نہیں کرتا؟ سعید دانش ور کے اسلوب کے لیے ترغیب (Persuasion) کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کے دانش ور کے تصور میں ایک گڑ بڑ پیدا ہوتی ہے۔ اگر دانش ور کا کام سوال اٹھانا ہے تو وہ اس کام سے ذہن کو جھنجھوڑتا ہے، نہ کہ کسی خاص جواب کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کرتا ہے۔ ترغیب، حکومتوں، سیاسی جماعتوں، تجارتی تنظیموں، مذہبی مبلغین کا طریق کار ہے، جنھیں سعید حقیقی دانش ور تسلیم نہیں کرتے۔ تاہم آگے چل کر سعید یہ کہتے ہیں کہ دانش ور نہ تو مصالحت کرانے والا ہے، نہ رائے ساز، بلکہ تنقیدی شعور کا حامل ہے۔ وہ سرکاری بیانیوں، میڈیا انڈسٹری کی تمثالوں، آسان فارمولوں، بنے بنائے کلیشوں، نیز سٹیٹس کو کی حامل سب قوتوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ سعید یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دانش ور کا کام ہر وقت حکومت پر نکتہ چینی نہیں، تاہم مستقل ذہنی تحرک اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے۔ سعید دانش ور کو چست و توانا (اتھلیٹک) عقلی توانائی کا حامل سمجھتے ہیں۔

سعید کے مطابق دانش ور کی سرگرمی کا بنیادی مقصد انسانی آزادی اور علم کی ترقی ہے۔ یہ مقصد تنظیمی دانش وروں کے مقصد سے متصادم ہے۔ تنظیمی یا جماعتی دانش ور اپنی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کو متعلقہ ادارے (جہاں سے وہ تنخواہ لیتا ہے) کی ترقی کے لیے کام میں لاتا ہے۔ وہ آفاقی اخلاقی اصولوں کی جگہ اپنے ادارے کے قواعد کی پابندی کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دانش ور کسی تنظیم یا ادارے سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ دانش ور کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہے۔ اصل سوال یہ ہے ایک حقیقی دانش ور کسی ادارے سے وابستگی کا کیا مطلب لیتا ہے؟ کیا وہ تنخواہ لینے کے عوض میں اپنے ضمیر کی آواز فروخت کرتا ہے، یا محض مہارت؟ ایک بات بالکل واضح ہے کہ دانش ور کی ذہنی دنیا اتنی محدود نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی بھی ادارے یا تنظیم کے مقاصد کے دائرے میں سما جائے۔ چوں کہ وہ بہت کچھ ایسا لکھتا ہے، جو اس کے تنظیمی فرائض سے مختلف اور الگ ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی ہی تنظیم کے حاشیے پر ہوتا ہے۔ اس ن س [illegible] عمرانیات سی رائٹ ملس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آزاد دانش ور یا تو اپنی حاشیائی حیثیت کی وجہ سے بے بسی کا مایوس کن احساس رکھتے ہیں یا اداروں، کارپوریشنوں، یا حکومتوں میں نسبتاً چھوٹے عہدے سنبھالنے کا امکان رکھتے ہیں جو اہم فیصلے غیر ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ہم پاکستان و ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے متعدد اساتذہ کی مثال پیش کر سکتے ہیں، جنھیں اپنی دانش وری کی خاطر اپنی پیشہ ورانہ ترقیوں کی بھینٹ دینا پڑتی ہے، اور بعض اوقات ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔

سعید دانش ور کے لیے آفاقی اصولوں، اقدار کا ذکر دہراتے ہیں۔ آفاقیت سعید سمیت متعدد مفکروں کے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی مانند ہے، جسے نہ نگلا جا سکتا ہے نہ اگلا۔ اپنے پہلے خطبے کے خاتمے پر وہ لیوتار کے اس نظریے سے برملا اختلاف کرتے ہیں کہ "عہد جدید کے آزادی اور روشن خیالی کے کبیری بیانیے مابعد جدید عہد میں باقی نہیں رہے"۔ سعید مابعد جدید مفکروں پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ مقامی صورت حال، لسانی کھیل اور اظہارات ونمائندگیوں (competence) کو اہمیت دیتے ہیں، اور یوں آفاقیت کو نظر انداز کرتے ہیں، مگر اگلے خطبے " قوموں اور روایتوں کو فاصلے پر رکھتے ہوئے" میں جن مباحث کو چھیڑتے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آفاقیت ایک تجرید ہے، اور دوسری عمومی تجریدوں کی مانند اس کا بھی سیاسی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اس خطبے کے آغاز ہی میں کہتے ہیں کہ ہندا کا دانش ور کو آفاقی دنیا کا باشندہ کہنا درست نہیں۔ ہندا دانش ور کو قومی یا نسلی شناخت سے ماورا اور ان "ماورائی اقدار" کا حامل سمجھتے ہیں جن کا اطلاق تمام قوموں پر

ہوتا ہے۔سعید کی رائے ہے کہ بندا جسے آفاقی دنیا کہہ رہے ہیں وہ حقیقتاً یورپی دنیا ہے(سوائے حضرت عیسیٰ کے)؛انیسویں صدی میں یورپ کی 'مقامی اقدار' کو آفاقی بنا کر پیش کیے جانے کا آغاز ہوا تھا۔سعید واضح کرتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد نوآبادیوں کے ختم ہونے،سرد جنگ کے شروع ہونے،اور تیسری دنیا کے وجود میں آنے کے بعد،نیز سفر اور ابلاغ کے وسائل میں اضافے کے بعد''یورپ اور مغرب پوری دنیا کے لیے معیار ساز نہیں رہے''۔یہاں سعید مابعد جدید مفکروں ہی کی اصطلاحات فرق(Difference)، دوسراپن(Otherness) اور مقامیت کاری(Localisation)استعمال کرتے ہیں۔فرق،دوسرے پن اور مقامیت کاری کی آگاہی بڑھی ہے۔اب یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ فرانسیسی دانش ور،چینی دانش ور کی طرح نہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی دانش ور چینی دانش ور کی مانند نہیں۔سعید واضح لفظوں میں قبول کرتے ہیں کہ''دانش ور کے آفاقی ہونے کا تصور لازماً تحلیل ہوا ہے''۔

دانش ور کے آفاقی تصور کو جو باتیں محال بناتی ہیں،ان میں سب سے اہم قومیت ہے۔قومیت سے جڑا اہم لفظ قوم پرستی ہے۔سعید یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ قوم پرستی کی تشکیل میں زبان کا کردار بنیادی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ رسل سے لے کر چومسکی تک کوئی اسپرانتو(مصنوعی عالمی زبان)میں نہیں لکھتا۔''ہر دانش ور ایک زبان میں پیدا ہوتا ہے اور زیادہ تر اسی زبان میں اظہار کرتے اپنی عمر بسر کر دیتا ہے،جو دانش ورانہ سرگرمی کے اظہار کا ذریعہ ہے''۔یہیں دانش ور ایک خاص مسئلے سے دوچار ہوتا ہے۔وہ جس زبان میں اظہار کرتا ہے،وہ پہلے سے موجود ہوتی ہے۔گویا دانش ور،زبان ایجاد نہیں ،اختیار کرتا ہے۔دانش ور کا مسئلہ یہ ہے کہ زبان میں اظہار کے بعض ایسے رویے غالب ہوتے ہیں،جن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ 'سٹیٹس کو' کو قائم،اور کچھ چیزوں کی پہلے سے موجود آگاہی کو جوں کا توں برقرار رکھیں۔سعید یہاں جارج آرول کے مشہور مضمون 'Politics and the English Language'(مطبوعہ ۱۹۴۶) کا حوالہ دیتے ہیں۔آرول کے مطابق کلیشے،مردہ استعارے،بے حس تحریریں زبان کے انحطاط کی علامتیں ہیں۔انھیں پڑھ اور سن کر ذہن سُن ہو جاتا ہے۔ان کا اثر ذہن پر اس پس منظری موسیقی کا سا ہوتا ہے جو کسی سپر مارکیٹ میں مدھم سروں میں بج رہی ہوتی ہے،جو شعور پر حاوی ہو جاتی اور خیالات و جذبات کو(اشیا کی)منفعل قبولیت کے لیے بہکاتی ہے۔کلیشے صرف زبان کا انحطاط نہیں،خیالات اور قوت ایجاد کا انحطاط بھی ہے،مگر اس انحطاط کا فائدہ سیاست دان اٹھاتے ہیں۔وہ کلیشوں کے ذریعے کئی قسم کی جھوٹی باتوں کو سچ بنا کر پیش کرتے ہیں۔سعید اس ضمن میں ان قومی کارپوریٹ شناختوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں''ہم''(we)اور''ہمیں''(us)جیسے الفاظ سے مستحکم کیا جاتا ہے۔قومی زبانوں میں جاری ہونے والے اخبارات میں''ہم امریکی''،''ہم برطانوی''اور اردو میں''ہم پاکستانی''جیسے الفاظ اس قومی شناخت کا تصور راسخ کرتے ہیں،جو اصل میں تجرید ہے۔سعید کے مطابق ''صحافت اس شے کو واضح اور ٹھوس بناتی ہے جو قومی زبان میں مضمر ہوتی ہے''۔قومی زبان میں''ہم''کے علاوہ''انھیں''(them)کا تصور بھی ہوتا ہے۔سعید کا تجزیہ ہے کہ''ہم''کے ذریعے اگر ایک طرف قومی شناخت پیدا ہوتی ہے،تو دوسری طرف اس شناخت کو ''انھیں''کی وجہ سے خطرے میں ہونے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔چناں چہ''اس[تفریقی شناخت]کے زیر اثر علم اور کمیونٹی[آفاقی نوعیت کی]نہیں،عدم رواداری اور خوف پیدا ہوتا ہے''۔عدم رواداری اور خوف حقیقی اور لفظی جنگوں کا باعث بنتے ہیں۔

اس بحث کے ذریعے سعید یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دانش ور کو کس قسم کی بندشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔آخر ایک دانش ور ان فصیلوں سے باہر کیسے نکلے جو قوم یا کسی دوسری قسم کی کمیونٹی(جیسے یورپ،مغرب،ایشیا،افریقا)نے تعمیر کر رکھی ہیں؟بہ قول سعید عوامی گفتگو میں''انگریز''،''عرب''، ''امریکی''یا''افریقی''سے بڑھ کر کوئی دوسرے الفاظ عام نہیں۔ان میں سے ہر لفظ نہ صرف پورے کلچر بلکہ ایک خاص ذہنی رویے(مائنڈ سیٹ)کا حامل بھی ہے۔قومی کارپوریٹ شناختوں سے عبارت ان الفاظ کے ذریعے کسی کمیونٹی میں حقیقی طور پر موجود مختلف وغیر متجانس عناصر کا انکار کیا جاتا ہے۔یہاں سعید مغرب کے اسلام کی طرف 'کارپوریٹ رویے' کا ذکر کرتے ہیں۔امریکی اور برطانوی اکیڈمک دانش ور،ایک ارب مسلمانوں کے بارے میں،جو نصف درجن (حقیقتاً کہیں زیادہ)زبانیں بولتے ہیں،غیر ذمہ دارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔وہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے بارے میں کبیری تعمیمات سے کام لیتے ہیں،اور اسلام اور جمہوریت،اسلام اور انسانی حقوق،اسلام اور ترقی میں عدم مطابقت سے متعلق ڈھٹائی سے آرا قائم کرتے ہیں۔سعید اسلام کو ایک مذہب اور کلچر سمجھتے ہیں؛یہ دونوں کسی واحد کلیے کے اسیر نہیں ہیں؛ان کی متعدد تعبیریں ہیں۔وہ شامی مسلم دانش ور ادونس کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کیا اسلام حکمرانوں کا ہے،یا انحراف پسند شعرا اور مسالک کا؟

مغرب اسلام کے غیر متجانس کردار پر زور دیتا ہے، اور اس کی تاریخ میں عقلیت وسائنس اور اجتہادی فکر کے حامل عناصر کی نفی کرتا ہے۔ یہاں سعید کا اشارہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسلام سے متعلق اس امریکی ڈسکورس کی طرف ہے، جس میں اشتراکیت کی جگہ اسلام کو ملی ہے۔ سعید کے یہ خطبات گیارہ ستمبر (نائن الیون) کے واقعے سے پہلے دیے گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد اسلام کی بابت امریکی ڈسکورس میں شدت پیدا ہوئی ہے۔

سعید کے نزدیک قوم پرستی سے متعلق کارپوریٹ فکر سے آزاد ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دانش ور' متجسس، تشکیک پسند فرد' کا کردار اختیار کرے۔ وہ ایک بار پھر یہ واضح کرتے ہیں کہ قوم اور گروہ فطری یا خدائی عطیہ نہیں، بلکہ تشکیل اور بعض صورتوں میں ایجاد ہیں، جن کے پیچھے جدوجہد اور فتح کی تاریخ ہے۔ قوم کے تاریخی طور پر تشکیل پانے کا یہ علم، دانش ور کو ذہنی آزادی دیتا ہے؛ وہ کسی عقیدے، اسطور، آئیڈیالوجی کے زیر اثر نہیں آتا؛ وہ انسانی معاملات کا تجزیہ اس انسانی علم کی مدد سے کرتا ہے، جسے ماورائے خطا ہونے کا گھمنڈ نہیں ہوتا۔ دانش ور کی نظر میں کوئی روایت اتنی مقدس نہیں ہوتی کہ اس کی تاریخ اور انسانوں پر اس کے اثرات کے ضمن میں سوالات قائم نہ کیے جاسکیں۔

چوں کہ قوم کی تاریخ جدوجہد اور تسخیر سے عبارت ہے، اس لیے دو طبقے وجود میں آتے ہیں: فاتح اور مغلوب؛ غالب اور نمائندگی سے محروم۔ دانش ور اگر کسی آفاقی اخلاقیات کا حامل ہو سکتا ہے تو وہ ہے، مغلوب، غیر نمائندگی پذیر، فراموش کردہ نظرانداز کردہ طبقے کی خاموشی کو آواز دینا۔ سعید ماہر عمرانیات ایڈورڈ شلس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دانش ور دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں: وہ یا تو غالب اقدار، اصولوں کے خلاف ہیں یا مصلحت آمیز انداز میں وہ عوامی زندگی میں تنظیم اور تسلسل مہیا کرتے ہیں۔ سعید کی رائے ہے کہ جدید دانش ور کے لیے اوّل الذکر کردار ہی حقیقی ہے، یعنی غالب رجحانات کو چیلنج کرنا، کیوں کہ غالب اقدار و اصول قوم سے جڑے ہیں جو ہمیشہ تسخیر پسند ہے، اسے اختیار و مرتبہ حاصل ہے؛ قوم، دانش ور سے تحقیق اور تجزیے کی بجائے وفاداری اور متابعت کا تقاضا کرتی ہے۔ دانش ور کو اس تقاضے کے آگے جھکنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اسے اپنی دانش ورانہ فکر کے سوا کسی سے وفادار نہیں ہونا چاہیے۔

اس خطبے کے آخری حصے میں دو اہم سوال سعید نے اٹھائے ہیں۔ ایک یہ کہ دانش ور لسانی بندشوں سے کیسے آزاد ہو، جن سے قومی شناخت مستحکم (اور ساتھ ہی خطرے سے دوچار) ہوتی ہے؟ سعید کا خیال ہے کہ قومی زبانیں ہمارے اردگرد برائے استعمال موجود نہیں ہوتیں، بلکہ انھیں 'اپنانا' (appropriate) پڑتا ہے۔ 'اپنانا' دراصل دانش ور کا مئوقف ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ قومی زبانوں کی تمام عمومی علامتوں کو بے چون و چرا قبول کر لیتے اور ان کی مدد سے اپنے تخیل میں قومی شناخت کا ایک پُر شکوہ قلعہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ وہ زبان کو 'اپناتے' نہیں، زبان کو موقع دیتے ہیں کہ وہ انھیں اپنا لے۔ جب کہ دانش ور سوال اٹھا کر، انحراف کی روش اپنا کر زبان کو اپناتا ہے۔ وہ عمومی علامتوں، کلیشوں وغیرہ میں اظہار کرنے کے بجائے، ان پر سوال قائم کرتا ہے؛ جن عمومی علامتوں سے ذہن سُن ہو جاتے ہیں، انھیں نہ صرف تحلیل و تجزیہ کا موضوع بناتا ہے، بلکہ ایک غیر عمومی اسلوب بھی اختیار کرتا ہے۔ یہیں ہمیں اس سوال کا جواب بھی ملتا ہے کہ کیوں دانش ور اپنا اظہار نئی اصطلاحات میں کرتے ہیں، اور کیوں خطیبانہ اور شاعرانہ اسلوب سے بیزار ہوتے ہیں۔ نسبتاً نامانوس زبان، ایک حقیقی تخلیق کار ہی کی نہیں، دانش ور کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات، کہاوتوں، معروف شعری استعاروں سے لبریز زبان ذہن کو لوری دیتی ہے، (جسے بعض لوگ لطف زبان یا لطفِ سخن کہتے ہیں) جگاتی نہیں۔

دانش ور کی قومی وفاداری کی کیا حقیقت ہے؟ اس دوسرے سوال کے ضمن میں سعید یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سب بغیر کسی استثنیٰ کے قومی، مذہبی یا نسلی کیمونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم خواہ کس قدر مزاحمت واحتجاج کر لیں، اپنے خاندان اور قومیت سے جدا نہیں ہو سکتے۔ سعید قوم و مذہب سے جڑے رہنے اور وفاداری کو مترادف نہیں سمجھتے۔ یوں بھی قوم سے علیحدگی کے بعد دانش ور مخاطب کس کو کرے گا؟ سعید کی رائے میں جب کوئی قوم سیاسی یا حقیقی طور پر کسی خطرے سے دوچار ہو (جیسے فلسطین و بوسنیا، یا طالبان کے ہاتھوں پاکستان) تو قومی دشمنوں کے خلاف دفاع لازم ہے۔ اسے وہ 'دفاعی قوم پرستی' کہتے ہیں۔ یعنی ایمرجنسی کی حالت میں قوم کی بقا باقی لوگوں کے ساتھ دانش ور کے لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ تاہم وہ فرانز فینن کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ''استعمار مخالف قوم پرستی کے مقبول گیت (جیسے پارٹی اور لیڈر شپ کی تائید) کا ساتھ کافی نہیں''۔ نیز'' کیا ہم نو آبادیات سے خود کو نجات دلانے کے لیے لڑ رہے ہیں یا ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ جب آخری سفید پولیس والا چلا جائے گا تو ہم کیا کریں گے؟ مقامی دانش ور کا مقصد محض سفید پولیس والے کو اس کے مقامی ہم منصب سے بدلنا نہیں، بلکہ نئی 'روحوں' کی ایجاد ہے''۔ سعید واضح لفظوں میں لکھتے ہیں کہ بقا کے

لیے اجتماعی جنگ سے وفاداری، دانش ور کی تنقیدی حس کو سُن نہیں کر سکتی۔اس دوران میں بھی اسے اپنی لیڈر شپ کی ان روشوں پر تنقید کرنی چاہیے، جن کی وجہ سے کچھ خیالات، معاملات حاشیے پر چلے جاتے ہیں دانش ور کو دفاعی قوم پرستی اور لیڈر شپ پر تنقید کے علاوہ ایک تیسرا کام بھی کرنا چاہیے۔مقامی بحران کو آفاقی بنانا؛ اپنی قوم کی تکالیف کو وسیع انسانی مفہوم دینا، اپنے تجربے کو دوسروں کے مصائب سے وابستہ کرنا۔

حاشیے کا تصور سعید کی فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔دانش ور طاقت کے ان تمام مظاہر اورعلامتوں کا پردہ چاک کرتا ہے، جو اخلاقی وعلمی اہمیت کے حامل معاملات کو حاشیائی حیثیت سے ہم کنار کرتی ہیں۔اس موضوع کی مزید وضاحت، سعید اپنے تیسرے خطبے بہ عنوان ''دانش ورانہ جلاوطنی: وطن بدر اور حاشیائی دانش ور''، میں کرتے ہیں۔خطبے کے آغاز میں سعید قبل جدید عہد اور جدید عہد کی جلاوطنی میں فرق کرتے ہیں۔قبل جدید عہد میں مخصوص افراد کو جلاوطنی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ان کے لیے وطن بدری ایک جذامی تجربہ تھا؛ جلاوطن کو اچھوت سمجھا جاتا تھا۔جدید عہد میں جلاوطنی پورے سماج کی ظالمانہ سزا میں بدل گئی ہے۔(سعید یہاں آرمینیائی لوگوں کی مثال دیتے ہیں۔مشرقی بحیرہ روم کے یہ باشندے ترکوں کے ہاتھوں نسل کشی کی وجہ سے الیپو، یروشلم اور قاہرہ میں آباد ہوئے۔دوسری عالمی جنگ کے بعد پھر دربدر ہوئے۔سعید پاکستان کی طرف مسلمان مہاجرین اور اسرائیل کی طرف یورپی و ایشیائی یہودیوں کی ہجرت کی مثال بھی دیتے ہیں)۔سعید اس مقبول عام مگر مکمل طور پر غلط مفروضے کی نفی کرتے ہیں کہ جلاوطن لوگ اپنی جنم بھومی سے یکسر کٹ جاتے، بیگانہ ہوجاتے، یا مایوسانہ طور پر الگ ہوجاتے ہیں۔قبل جدید عہد میں جلاوطن شخص کو کوئی شے اپنے وطن کی یاد دلانے کو موجود نہیں ہوتی تھی؛ وہ ماضی کے سلسلے میں حد درجہ دل شکستہ اور حال و مستقبل کے ضمن میں تلخی کے احساسات رکھتا تھا، جب کہ جدید زمانے میں متعدد چیزیں ایک جلاوطن شخص کو اپنے وطن و ماضی کی یاد دلاتی ہیں (جیسے وہاں کے لوگوں، اشیا، مصنوعات کی مسلسل آمدورفت سے، اور ذرائع ابلاغ کی خبریں، رپورٹیں وغیرہ)۔چناں چہ بہ قول سعید آج کا جلاوطن ایک وسطی حالت میں رہتا ہے؛ وہ نہ تو پورے طور پر نئے ماحول سے ہم آہنگ ہوتا، نہ قدیم ماحول سے مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے؛ وہ نیم شرکت اور نیم علیحدگی سے مغلوب رہتا ہے؛ ایک سطح پر ناسٹلجیائی اور جذباتی ہوتا ہے، اور دوسری سطح پر (نئے ماحول کی) ماہرانہ انداز میں نقل کرنے والا، ایک خاموش آوارہ وطن ہوتا ہے۔سعید اس ضمن میں وی ایس نائپال کے ناول *Bend in the River* کے مرکزی کردار سلیم کی مثال دیتے ہیں جو ہندوستانی نژاد مشرقی افریقی مسلمان ہے۔

سعید جلاوطن کمیونٹی کی صورت حال کا خیال انگیز تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ پاکستان اور اسرائیل کے مہاجرین پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی ہجرت، تقسیم اور علیحدگی کی آئیڈیالوجی کے تحت ہوئی تھی۔اس آئیڈیالوجی نے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے انھیں زندہ رکھا ہے۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (جلاوطن گروہوں کے) دانش ور جب تک خود کو بے خانماں کمیونٹی کو متاثر کرنے والی صورتِ حال کا حصہ سمجھتے ہیں، وہ ثقافتی آمیزش (acculturation) سے زیادہ، ثقافتی عدم توازن کا سرچشمہ بننے کا امکان رکھتے ہیں۔حقیقتاً یہ دانش ور اپنی قدیمی شناخت اور نئی، نسبتاً مختلف ثقافتی صورت حال میں موجود خلا کو پر کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے، اسے ابھارنے اور اس کی بنیاد پر مراعات حاصل کرنے کی سیاست کرتے ہیں۔

اس خطبے کا انتہائی فکر انگیز نکتہ جلاوطنی کو ایک استعاراتی حالت کہنا ہے۔سعید کے مطابق اگرچہ جلاوطنی ایک حقیقی حالت ہے، ساتھ ہی یہ ایک استعاراتی حالت بھی ہے۔نیز جلاوطنی محض ہجرت اور بے دخلی کی سیاسی تاریخ تک محدود نہیں۔سعید اس بات کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ کسی معاشرے کے تاحیات شہری بھی درونی رمانوس (insiders) اور بیرونی راجنبی (outsiders) افراد میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔درونی افراد کسی بغاوت وانحراف کی واضح آواز کے بغیر جی حضوریے (yea-sayers) ہوتے ہیں؛ وہ سماج کا ساتھ دینے کے بدلے ترقی پاتے ہیں۔دوسرے انکار پسند (nay-sayers) ہوتے ہیں؛ ان کے سماج سے تعلقات ناہموار ہوتے ہیں؛ بغاوت وانحراف کی اونچی لے کی وجہ سے وہ مراعات، طاقت، اختیارات اور اعزازات نہیں پاتے۔

جلاوطنی کی حقیقی صورت حال عبارت ہے، مقامی لوگوں کی مانوس فضا میں خود کو اجنبی محسوس کرنے سے۔تمام 'بیرونی دانش ور' خود کو اپنے ہی سماج میں اجنبی پاتے ہیں۔سعید کی رائے میں، اس مابعد الطبیعیاتی مفہوم میں جلاوطنی کا مطلب ہے، بے چینی، بے قراری، مستقل طور پر مضطرب ہونا اور مضطرب رکھنا۔گھر واپسی کا ناممکن ہونا اور نئی جگہ میں بے خانماں ہونے کا احساس ہی، تمام اضطراب کا باعث ہے۔اہم بات یہ ہے کہ جلاوطن دانش ور اس اضطراب کو دبانے کی بجائے، اسے اپنی فکر کی غذا بناتا ہے۔جلاوطنی اپنے بھرپور استعاراتی دلالتوں کے

ساتھ ،اس کا طرزِ فکر بن جاتی ہے۔ یہاں سعید تھیوڈور ڈبلیو اڈورنو (۱۹۰۳ء۔۱۹۶۹ء) کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں نازی جرمنی سے ہجرت کر کے، پہلے لندن اور پھر امریکا جانے والے ،اور ۱۹۴۹ میں واپس جرمنی آنے والے اڈورنو ایسے مفکر ہیں جنھیں سعید 'بیسویں صدی کا ممتاز دانش ورانہ ضمیر' قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اڈورنو کا نیویارک میں پانچ سال (۱۹۳۶ تا ۱۹۴۱) قیام رہا، مگر انھوں نے جلاوطنی کو اس کے حقیقی و استعاراتی معنوں میں ایک گہرا تجربہ بنایا۔ بہ قول سعید وہ اپنے جوہر میں دانش ور تھا، یعنی تمام نظاموں سے نفرت کرنے والا، خواہ وہ 'ہمارے' ہوں یا 'ان کے'۔ اڈورنو ایک مستقل جلاوطن دانش ور تھا۔ اڈورنو کہتے ہیں کہ حقیقی معنوں میں قیام اب ناممکن ہے۔ وہ روایتی قیام گاہیں، جہاں ہم پلے بڑھے ،اب ناقابل برداشت ہوگئی ہیں؛ ان کی آسائش کی قیمت علم کے ظہور (اور نئے انکشافات) سے ادا کی جا چکی ہے۔ اڈورنو مزید کہتے ہیں کہ گھر اب قصہ ماضی ہے۔ نئی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ 'گھر میں بے گھر رہا جائے'۔ نیز غلط زندگی صحیح طور پر نہیں گزاری جاسکتی۔ سعید، اڈورنو کے مؤقف کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ جلاوطنی جس وسطی حالت کی علم بردار ہے، وہ حالت بھی ایک جامد آئیڈیالوجی میں بدل سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی شخص، گھر اور بے گھری کی حالت سے وابستہ اضطراب کا عادی ہوسکتا ہے، جس کا مطلب دانش ورانہ جوہر (بے چینی) کی موت کے سوا کچھ نہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کلاسیکی اردو شاعری میں گھر اور بے گھری کے تجربے سے وابستہ اضطراب کا اظہار عام ملتا ہے۔ جسے سعید نے مابعد الطبیعیاتی جلاوطنی کا نام دیا ہے، اس کی اتنی کیفیتیں اردو شاعری میں ملتی ہیں کہ ان پر الگ ایک مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ جلاوطنی کے مضمون کی تہ میں کہیں تو وحدت الوجودی فکر کام کر رہی ہے، کہیں عشق کی غارت گری ،کہیں ناقدری زمانہ، کہیں روح و بدن کی کش مکش اور کہیں اپنے عہد سے اجنبیت کا احساس۔ یہ چند اشعار دیکھیے:

مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں تس پہ وحشت ہے
قیامت تھی اگر ہم اس خرابہ میں وطن کرتے

انعام اللہ یقیں

رہے پھرتے دریا میں گرداب سے
وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

میر تقی میر

کون ومکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

الطاف حسین حالی

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

مرزا غالب

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

علامہ اقبال

ذکر ہو رہا تھا اڈورنو کا۔ ان کی فکر کی ترجمانی ان کے اس انداز تحریر میں ہوتی ہے، جو انتہائی حدوں میں تشکیل پاتا ہے۔ ایقان شکن تشکیک اور اطمینان کو پارہ پارہ کرنے والا استفہام ہی ،دانش ور کو انتہائی حدوں میں لے جاتے ہیں۔ اڈورنو کہتے ہیں کہ جس کے پاس گھر نہیں، اس کے لیے، اس کی تحریر ہی رہنے کی جگہ ہے۔ اڈورنو کی دانش میں چوں کہ قیام ناممکن ہے، اس لیے تحریر بھی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوسکتا۔ مستقل ٹھکانہ ،حد یا منجمد آئیڈیالوجی میں بدلنے کا امکان رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ادیب /دانش ور تحریر سے جلاوطن کیسے ہو؟ اسے اپنی تحریر کو مخصوص اسلوب، کلیشوں، چند گنے چنے سوالات، پیش گوئی کیے جانے والے استفہامیوں کی آماج گاہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ بہ قول سعید دانش ور بنیادی طور پر علم اور آزادی کا علم بردار ہے (یہ ایک تجریدی بات نہیں، ایک حقیقی تجربہ ہے)۔ وہ رابنسن کروسو کی طرح نہیں جس کا مقصد ایک چھوٹے جزیرے کو نوآبادی بنانا ہے ،مارکو پولو کی مانند ہے جو ہر مقام پر خود کو عارضی مہمان سمجھتا ہے؛ حملہ آور اور فاتح نہیں۔ ادیب /دانش ور کے لیے روا نہیں کہ وہ اپنی تحریر کو اپنی نو آبادی بنائے؛ اسے اپنی ہر تحریر کو عارضی ٹھکانہ بنانا چاہیے۔ یہ ان لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو اپنے اسلوب خاص پر فخر کرتے ہیں۔

اڈورنو دانش ورانہ فکر کو جن انتہائی حدوں میں لے جانے کی تجویز پیش کرتے ہیں، ان کا نتیجہ یاسیت اور کلبیت ہوسکتا ہے۔ سعید دانش ور کے لیے تشکیک، شوخی اور طنز کو تو ضروری قرار دیتے ہیں، مگر کلبیت کو نہیں۔ دانش ور کی جلاوطنی اسے سماج میں حاشیائی مقام دیتی ہے؛ انعامات واعزازات، ایک طرح سے گھر کی فضا سے عبارت ہیں۔ انعام واعزاز کی مانوس دنیا میں دانش ور کی اجنبیت اسے حاشیائی حیثیت دیتی ہے۔ اگر دانش ور اپنی جلاوطنی کو گریہ وزاری میں بدل لیتا ہے ،تو اس کا کلبی ہوجانا یقینی ہے۔ انعامات واعزازات سے محرومی کا قلق اسے ایک مایوس روح میں بدل سکتا ہے۔ سعید اس خیال کے حامی محسوس ہوتے ہیں کہ تحریر، دانش ور کا گھر ہوسکتی ہے۔ دانش ورانہ تحریر کے اپنے اعزازات ہیں اور تحریر ایک اور قسم کے گھر کی فضا کی حامل ہوسکتی ہے۔ اڈورنو کے یہاں نطشے کی عدمیت کا عکس محسوس ہوتا ہے، جو تمام اخلاقی اقدار کی معروضی بنیاد کا یکسر انکار کرتی ہے۔ جب کہ

سعید ان اقدار پر سوال قائم کرتے ہیں، جو دنیا کو 'محروم اور مراعات یافتہ طبقوں' میں تقسیم کرتی ہیں۔ سعید تجریدی فلسفیانہ فکر پر سماجی، سیکولر فکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک انوکھا اتفاق ہے کہ اردو میں مرزا غالب دانش ور کے اسی تصور کے حامل محسوس ہوتے ہیں، جسے سعید ان خطبات میں دہراتے ہیں۔ تشکیک، شوخی اور طنز غالب کی شاعری کے اساسی عناصر ہیں۔ غالب ان تمام کبیری تصورات پر شوخ و طنزیہ انداز میں استفہام قائم کرتے ہیں، جو اپنی اصل میں تجرید ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر: نشا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کوئی / عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو، دانش ورانہ شوخی کا کیسا عمدہ اظہار ہے۔

سعید کے نزدیک جلاوطنی کا سب سے اہم تحفہ 'دوہرا تناظر' ہے۔ جلاوطنی کا ہر منظر یا صورتِ حال گھر کے منظر یا صورتِ حال کی طرف دھیان منتقل کرتی ہے۔ بہ قول سعید عقلی طور پر اس کا مطلب ہے کہ ہر خیال یا تجربہ، دوسرے خیال یا تجربے کے روبرو ہے۔ نئے ملک اور پرانے ملک کے تناظرات کے دوبدو ہونے سے، دونوں ایک نئی روشنی میں آجاتے ہیں، اور ایک ایسے علم کو ممکن بناتے ہیں جس کی پہلے پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ دوہرا تناظر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ ہم اپنے وطن کو دوسروں کی نظر سے اور دوسروں کو اپنے وطن کی نگاہ سے دیکھ سکیں۔ بسا اوقات حب الوطنی ہمیں تنگ نظری و تعصب کا شکار کرتی ہے، دوہرا تناظر ہمیں ان سے آزادی دلاتا ہے۔ یہاں سعید ایک بار پھر مغرب کے اسلام سے متعلق ڈسکورس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں نے محسوس کیا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی سے متعلق یورپ کی انتہائی ناقص بحثیں دانش ورانہ طور پر اشتعال انگیز ہیں، کیوں کہ ان کا موازنہ یہودی یا عیسائی بنیاد پرستی سے نہیں کیا گیا، جو مشرقِ وسطیٰ کے میرے تجربے کے مطابق غالب اور نفرت انگیز ہیں"۔ گویا ان بحثوں پر یورپ کا محض ایک، مقامی تناظر حاوی ہے۔ سعید خود مسلمان ملکوں میں اسلام کی بحثوں کا حوالہ نہیں دیتے، جہاں ایک طرف اسلام کے نام پر بادشاہت کے ظالمانہ نظام کی دہشت سے لے کر فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم ہے، اور دوسری طرف مغرب کی سیکولر فکر کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو اسلام کے سلسلے میں مغرب کے دانش ور کرتے ہیں۔ دونوں جگہ واحد، مقامی تناظر حاوی ہے۔ مغرب میں اسلام کی بحثیں اور مسلم دنیا میں مغربی تہذیب کی بحثیں، دو انتہاؤں پر ہیں۔ اس 'انتہا پسندی' کا نقصان مغرب کو کم، مگر مسلم دنیا کو زیادہ ہے۔ عام طور پر مسلم دنیا کے دانش ور، اسلام سے متعلق مغربی مباحث کو بنیاد بنا کر سیکولر انسانی تہذیب کے حقیقی ثمرات سے نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان ملکوں کے تناظر میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا یہاں اس ایقان شکن تشکیک کے لیے فضا سازگار ہے، جو دانش وری کی اساس ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کو اخباری کالم نویس، اینکر پرسن اور ان کے پروگراموں میں روزانہ شام کو گل افشانی گفتار کا مظاہرہ کرنے والے 'ماہرین' زیرِ بحث لانے سے تو رہے!

کیا ایک دانش ور پوری آزادی کے ساتھ، من موجی انداز میں کام کرسکتا ہے؟ معاشی اعتبار سے کسی کا مرہونِ منت، اور نظریاتی لحاظ سے کسی کا وفادار ہوئے بغیر کیا وہ دانش ورانہ سرگرمی جاری رکھ سکتا ہے؟ انیسویں صدی میں بوہیمین دانش ور کا تصور سامنے آیا تھا، جب کہ بیسویں صدی میں کیفے فلسفی، ٹی ہاؤس دانش ور کی جگہ تنظیمی دانش وروں نے لے لی؛ بیسویں صدی میں علم کی صنعت کے غیر معمولی فروغ سے 'دانش وروں' کی بہتات ہوگئی۔ یہ 'دانش ور' سرکاری، نیم سرکاری، نجی اداروں اور سیاسی، مذہبی، فلاحی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور تنخواہ اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ادارے یا جماعت کے معاشی و نظریاتی مفادات سے وفاداری کا مظاہرہ کریں۔ اسی تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ایک ایسے دانش ور کا آج تصور کر سکتے ہیں جو کارپوریٹ فکر کی بجائے، انفرادیت پسند فکر کا حامل ہو؟ سعید یہ سوال اپنے چوتھے خطبے "پیشہ ور اور باذوق دانش ور" میں اٹھاتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب ضروری ہے، کیوں کہ یہ جواب، دانش ور کے ہم سے خطاب کی توقعات کو متاثر کرتا ہے۔ کیا اس کا نقطۂ نظر ایک آزاد شخص کا نقطۂ نظر سمجھا جائے، یا حکومت، منظم سیاسی جماعت، کسی لابی کا نقطۂ نظر؟ سعید یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آج انیسویں صدی کے بوہیمین دانش ور کا تصور ممکن نہیں؛ آج ہر دانش ور کسی نہ کسی ادارے سے وابستہ ہے۔ لیکن کیا ادارے سے وابستگی، اس کی آزادانہ رائے کو ناممکن بناتی ہے؟ سعید کہتے ہیں کہ اس سوال کا جواب مثالیت اور حقیقت کے امتزاج کی روشنی میں زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے، نہ کہ کلبیت کی روشنی میں۔ کلبی شخص بہ قول آسکر وائلڈ، وہ شخص ہے جو ہر شے کی قیمت جانتا ہے، مگر قدر کسی کی نہیں۔ سعید کے مطابق یہ سمجھنا ایک کلبی رویہ ہوگا کہ پورا معاشرہ اس قدر بدعنوان ہوگیا ہے کہ ہر شخص دولت کے آگے جھک جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مکمل بے نیاز، خودنگر دانش ور کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ گویا ادارے سے وابستگی کے باوجود ایک شخص، حقیقی دانش ور کا کردار ادا کرسکتا ہے۔ گویا بوہیمین دانش ور کا تصور مثالی مگر ادارے سے وابستگی کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم

رکھنا حقیقت پسندانہ تصور ہے۔تاہم وہ اکیڈمک دانش وروں کے ضمن میں یہ ضرور کہتے ہیں کہ بیسویں صدی میں ان کی تحریریں فقط عوامی مباحث پر مرکوز نہیں، بلکہ تنقید اور بت شکنی سے متعلق ہیں، جن میں قدیم روایات کے جھوٹے پیغمبروں کو بے نقاب کیا گیا اور کھوکھلے ناموں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔ یہاں ان کا واضح اشارہ نئی تنقیدی تھیوری کی طرف ہے، جو اتھارٹی کی ہر شکل کو معرضِ سوال میں لاتی ہے۔

سعید اپنے خطبات میں دانش ور کی انفرادیت پر جا بجا زور دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں دانش ور کو کارپوریٹ فکر کا شکار ہونے اور اس کا ترجمان بننے سے اگر کوئی شے بچا سکتی ہے تو وہ اس کی انفرادیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپوریٹ فکر کی آکاس بیل ،دانش ور کے بنیادی جوہر ہی کو چوس لیتی ہے۔ بوہیمین دانش ور کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ ان تمام تنظیموں سے بے زاری کی حد تک دور تھا، جو اسے سٹیریو ٹائپ فکر کے دام میں لا سکتی تھیں، اور اس طرح وہ اپنی شدید انفرادیت کا تحفظ کر سکتا تھا، مگر جدید دانش ور اس سہولت سے محروم ہے۔ اردو میں بوہیمین دانش ور کا اوّلین، اور نسبتاً نامکمل تصور ہمیں توبتہ النصوح کے کلیم کی شکل میں ملتا ہے۔ وہ جب اپنے باپ سے کہتا ہے: مجھ کو تمھارے ماں باپ ہونے سے انکار نہیں۔ گفتگو اس باب میں ہے کہ تم کو میرے افعال میں زبردستی دخل دینے کا اختیار ہے یا نہیں۔ سو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے"، تو وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ کرتا ہے۔ باپ کی اتھارٹی سے انکار، استعاراتی طور پر سماج کی مقتدر قوتوں سے انکار ہے۔ اس کے انکار کی بنیاد ،شاعری سمیت دیگر فنون سے اس کی دل چسپی میں ہے۔کلیم کا رویہ ایک باذوق شخص (amateur) کا رویہ ہے۔ یہ اسی باذوق دانش ور کی تصویر ہے، جسے سعید اپنے زیرِ بحث خطبے میں تنظیمی دانش ور کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں میراجی کلیم کی بوہیمین دانش ور کی نامکمل تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔ جو چیز کلیم کے یہاں استعارے کی سطح پر تھی، وہ میراجی کے یہاں ایک حقیقت بن جاتی ہے؛ میراجی سماجی اشرافیہ کی سب اہم علامتوں کے منکر تھے۔ میراجی کی انفرادیت اپنا مفہوم ،اشرافیہ کلچر کی کارپوریٹ فکر کا مضحکہ اڑانے کی صورت میں متعین کرتی ہے۔ یہی کام ایک دوسرے انداز میں منٹو نے کیا۔

دانش ور کی انفرادیت ،ایک بات ہے اور اس انفرادیت کا 'اثر' دوسری بات ہے۔ سعید نے یہ نکتہ اجاگر نہیں کیا۔ قصہ یہ ہے کہ دانش ور کی انفرادیت کا اثر سماج میں اس صورت میں، اور اسی حد تک پڑ سکتا ہے، جہاں تک سماجی رشتے اس امر کی اجازت دیں۔ اسی سے ہم اس سوال کا جواب بھی تلاش کر سکتے ہیں کہ دانش وروں کے غیر معمولی خیالات کے باوجود ،سماج میں ان کی روشنی میں کوئی تبدیلی کیوں رونما نہیں ہوتی۔ جسے ہم تبدیلی کہتے ہیں، وہ دانش ور اور سماج کے درمیان ابلاغ کا دوطرفہ رشتہ قائم ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ نیز اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کیوں ایک معاشرے میں دانش ور کی تحریریں، بیانات واضح اثر رکھتے ہیں اور کسی دوسرے معاشرے میں کیوں بے اثر رہتے ہیں؟

سعید کی رائے ہے کہ آج مغربی اور غیر مغربی دنیا میں دانش ور کو اگر کسی طرف سے خطرہ ہے تو وہ اکیڈمی ہے ،نہ مضافات ہیں، صحافت کی جادو اثر صارفیت ہے نہ پبلشنگ ہاؤس، بلکہ اس رویے سے ہے، جسے میں پیشہ وریت (پروفیشنل ازم) کہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنی دانش ورانہ فکر اور اپنی معاشی فکر میں حد فاصل قائم نہ رکھے؛ وہ اپنے دانش ورانہ کام کو بھی روٹی روزی کے کام کی طرح سمجھے، جس میں نو تا پانچ آنکھ گھڑی پر لگی رہتی ہے، اور کوئی متنازع بات نہیں کہی جاتی ہے، خود کو ادارے یا منڈی کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جاتا ہے، تو یہی پیشہ وریت ہے۔ پیشہ وریت کا سادہ مفہوم نپی ذہانت اور علم کو کسی ایسے مقصد کے لیے کام میں لانا ہے ،جس کا تعین ادارے اور تنظیمیں اپنے محدود مفادات کے لیے کرتی ہیں۔ یہ اپنے علم و مہارت کی سیدھی سادھی فروخت ہے۔ اس پر سوالیہ نشان اس وقت قائم ہوتا ہے ، جب اس مہارت کو دانش کہنے پر اصرار کیا جائے۔ علم و مہارت کی فروخت کی ایک اور صورت بھی ہے۔ انعام و اعزاز۔ چوں کہ یہ حکومتوں ،مقتدر اداروں کی طرف سے ملتے ہیں، اس لیے انھی لوگوں کو ملتے ہیں جو انھیں للکارتے نہیں؛ وہ ان کی روشوں پر سوال اٹھانے کی بجائے ،ان کے نظریات و اعمال کی توثیق کرتے ہیں ۔اس کے بدلے ہی میں انھیں انعام و اعزاز ملتے ہیں۔ سارتر (جنھوں نے ۱۹۶۴ میں ادب کا نوبل انعام ٹھکرا دیا تھا) تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص سوسائٹی کے مطالبات و ترغیبات میں گھرا ہے، وہ دانش ور ہی نہیں ہو سکتا۔ سعید دراصل دانش ور کے لیے حاشیائی حیثیت کو اصول بنا لیتے ہیں۔ دانش ور کو اپنے ادارے ، سوسائٹی، ملک میں طاقت کے مرکز سے دور، حاشیے پر رہنا چاہیے، تا کہ وہ مرکز پر سوال قائم کرتا رہے۔

سعید کی نظر میں پیشہ وریت ،دانش ور پر چار قسم کے دباؤ ڈالتی ہے۔ اوّل تخصیص کاری۔ آج سب سے زیادہ اسی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ سعید کے مطابق تخصیص کا مفہوم ہے، آرٹ یا علم کو تشکیل دینے والی خام قوتوں (تاریخ و سیاست) کے سلسلے میں بے

بصری۔ تخصیص سے دریافت اور جوش کی وہ حس ہی ختم ہو جاتی ہے، جس پر دانش ور کا بنیادی انحصار ہوتا ہے؛ تخصیص کار مکمل طور پر دوسروں کی آرا کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ دوم سندی نوعیت کی مہارت۔ بہ قول سعید، اس میں تسلیم شدہ معیارات کی جگالی ہوتی ہے۔ جو لوگ، ادارے، تنظیمیں ان معیارات کو مسلمہ قرار دیتی ہیں، وہ دیگر مختلف معیارات کے سلسلے میں عدم رواداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سوم طاقت واتھارٹی کی طرف جھکاؤ۔ پیشہ وریت، طاقت و اتھارٹی کی طرف جھکنے کا میلان رکھتی ہے، تاکہ اسے اپنی خدمات بیچ کر مراعات حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں سعید امریکا سمیت مختلف ملکوں کے حکومتی اداروں کی طرف سے تحقیقی گرانٹس کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں سماجی سائنس کے پیشہ ور ماہرین حاصل کرتے اور متعلقہ اتھارٹی کے ایجنڈے کے مطابق نظریات وضع کرتے ہیں۔ تاہم سعید یہاں یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ امریکا و یورپ میں 'کرائے کی تحقیق' کے متوازی حقیقی، بے غرض تحقیق کی اہمیت کا احساس باقی رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ نوم چومسکی کی مثال لاتے ہیں۔ بھارت میں اروندھتی رائے اس حقیقی، دانش ورانہ تحقیق کی اہم مثال ہیں۔

پیشہ وریت کے اس جبر سے آزادی کی کیا صورت ہے؟ سعید ایک لفظ میں جواب دیتے ہیں: غیر پیشہ وریت (amateurism)۔ کلاسیکی مفہوم میں غیر پیشہ ور، باذوق دانش ور کسی دباؤ اور جبر کی پروا نہیں کرتا، نہ کسی لالچ و ترغیب کے دام میں گرفتار ہوتا ہے؛ آرٹ اور علم سے اس کا تعلق غیر افادی ہوتا ہے۔ اگر آرٹ کی روح، حسن اور علم کی روح، بصیرت ہے تو اسے فقط ان سے غرض ہے۔ سعید 'غیر پیشہ ور، باذوق دانش ور' کے کلاسیکی تصور کو پورے طور پر قبول کرتے محسوس نہیں ہوتے۔ شاید اس لیے کہ کلاسیکی مفہوم میں 'باذوق، غیر پیشہ ور شخص' آرٹ و علم کی سماجی افادیت پر توجہ نہیں کرتا (جیسے کلیم یا میرا جی)، جب کہ سعید دانش ور کے سیاسی و سماجی کردار کے شدت سے حامی ہیں۔ اسی طرح وہ تحقیق کے پیشہ ورانہ اصولوں اور رسمیات کے جبر سے تو انکار کرتے ہیں، مگر بذاتہ ان سے نہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ باذوق دانش ور معاشرے کے ایک سوچنے والے، مضطرب رکن کے طور پر اسے اپنا حق سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ٹیکنیکل اور پروفیشنل سرگرمی کے عین دوران میں اخلاقی سوال اٹھائے۔ خاص طور پر یہ سوال کہ کس بات سے کون فائدہ اٹھاتا ہے؟ اس طرح وہ ان قوتوں کی نشان دہی کی کوشش کرتا ہے، جو کسی ڈسکورس سے بہ ظاہر فاصلے پر ہوتی ہیں، مگر اس سے منفعت حاصل کر رہی ہوتی ہیں۔ غیر پیشہ ور دانش ور کے سامنے یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ آیا اس کے قارئین ایک صارف کی طرح مطمئن ہو رہے ہیں، یا انھیں چیلنج کیا جا رہا ہے، یعنی انھیں مکمل اختلاف کی تحریک دے کر معاشرے میں جمہوری شرکت کے قابل بنایا جا رہا ہے، یا نہیں؟ سعید دانش کے نام پر خاص طرح کے خیالات کی اجارہ داری کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر دانش وری کا اہم فریضہ جھوٹے پیغمبروں کو بے نقاب کرنا اور بت شکنی ہے، تو خود دانش ور کیوں کر ایک پیغمبر اور بت کے طور پر اپنی نمائندگی کا ارتکاب کر سکتا ہے؟

'طاقت ور کے سامنے کلمہ ء حق' سعید کے پانچویں خطبے کا عنوان ہے۔ سعید کے مطابق دانش ور کے لیے بنیادی سوال یہ ہیں کہ کوئی شخص سچ کیسے بولتا ہے؟ کون سا سچ؟ کس کے لیے؟ کہاں؟ سعید کہتے ہیں کہ بدقسمتی سے کوئی ایسا نظام یا طریقہ ء کار موجود نہیں جو اس قدر وسیع اور یقینی ہو کہ دانش ور کو ان سوالات کے راست جواب دے سکے۔ کچھ نظامِ فکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سچائی کا حتمی علم رکھتے ہیں۔ سعید غالباً انھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہماری دنیا سیکولر ہے، اس مفہوم میں کہ اس کی تعمیر انسانی کوششوں سے ہوئی ہے۔ لہٰذا دانش ور مذکورہ سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے سیکولر طریقے (تاریخی و سماجی تجزیے کے طریقے) ہی کام میں لا سکتا ہے۔ سعید تسلیم کرتے ہیں کہ وحی و الہام نجی زندگی [کے معاملات کی] تفہیم کے لیے مکمل طور پر قابلِ عمل طریقے ہیں، لیکن اس وقت یہ تباہ کن بلکہ وحشیانہ بن جاتے ہیں، جب نظریاتی ذہن کے حامل مرد و عورت انھیں استعمال کرتے ہیں۔ بہ قول سعید: ''لاریب، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ دانش ور کو لازماً مقدس وژن یا متن کے محافظوں سے تا حیات بحث میں شریک رہنا چاہیے، جن کی غارت گری کی کوئی حد نہیں، جن کی سخت گیری کسی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتی، اور اس طرح [سماج میں] تنوع پیدا نہیں ہوتا''۔ گویا ذاتی زندگی میں مذہب ایک نعمت، مگر ایک سماجی نظریے کے طور پر تباہ کن ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی فکر نے دنیا کو مادی مظہر ہی سمجھا اور اس کی تفہیم میں عقلی طریقوں کو استعمال کیا ہے۔ اردو میں سرسید نے (بیسویں صدی کے سیکولر انسان دوست فلسفی برٹرینڈ رسل سے پہلے) انیسویں صدی کے اواخر میں لکھا تھا کہ ''قدیم اصول یہ ہے کہ مذہب روحانی اور جسمانی یعنی دینی و دنیوی دونوں کاموں سے متعلق ہے۔ جدید اصول یہ ہے کہ مذہب صرف روحانی کاموں سے متعلق ہے''۔ سعید اور سر سید کے یہ خیالات آج پاکستان میں جاری مذہبی شدت پسندی کے سلسلے میں کس قدر برمحل معلوم ہوتے ہیں، یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ مذہبی گروہوں

کی غارت گری ،مقدس متن کے نام پر ہے۔اقبال نے سیاست کے دین سے جدا ہونے کو چنگیزی کہا تھا،مگر مذہبی گروہوں،مذہبی سیاسی جماعتوں میں دین وسیاست کی آمیزش،چنگیزیت کی صورت اختیار کرگئی ہے۔پاکستان کے اہل دانش کا مخمصہ اس قدر انوکھا ہے کہ شاید اس کی کہیں مثال بھی نہ ہوگی۔مذہب کے نام پر وجود میں آنے والی ریاست میں،ایسے گروہوں کو وجود میں آنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے جو ریاست کے تمام قوانین کو مذہبی بنانے کی جدو جہد کو مقصدِ حیات بنالیں،اور جو لوگ مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود رکھنے کے قائل ہوں،ان کے خلاف صف آرا نہ ہوں؟ یہ ایک ایسا مخمصہ ہے،جس سے نکلنے کے لیے کبھی کبھی قائداعظم کی گیارہ اگست کی مشہور تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے،جس میں انھوں نے پاکستانی شہریت کی تعریف بلا مذہب وفرقہ کی تھی،مگر اس کے جواب میں قائداعظم کے متعدد ایسے خیالات پیش کیے جاتے ہیں جو پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے سے متعلق تھے۔اس کا نتیجہ کنفیوژن ہے،نتیجہ خیز مباحثہ نہیں۔

سعید کو یہ ماننے میں تامل نہیں کہ الوہی صداقت میں یقین رکھنے والوں کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے،اور یہ حق انھیں سیکولر دنیا دیتی ہے۔سیکولر دنیا بحث مباحثے میں تمام لوگوں کی جمہوری شرکت کی قائل ہے۔سیکولر دانش ور رائے ظاہر کرنے میں یقین رکھتا ہے،مسلط کرنے میں نہیں۔یہی اصول مذہبی دانش وروں کے لیے بھی ہے۔بہ قول سعید،سیکولر دانش ور کا اگر کوئی قلعہ ہوسکتا ہے تو وہ رائے کی تشکیل اور اظہار کی آزادی ہے۔اسی اصول کی بنا پر سعید سلمان رشدی کے حق میں آواز بلند کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

کیا سیکولر ہونے کا مطلب سچائی کے ایک غیر متنازع تصور کا حامل ہونا ہے؟ کیا سیکولر سچائی ایک معروضی سچائی ہے؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہو تو ایک سیکولر اور ایک مذہبی دانش ور میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ سعید کو بھی اس نزاکت کو احساس ہے،اس لیے وہ امریکی مؤرخ پیٹر نووک کی کتاب *That Noble Dream* (مطبوعہ ۱۹۸۸) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقت رسچائی سے متعلق اتفاق رائے غائب ہوگیا ہے۔نیز روایتی اتھارٹی بھی باقی نہیں رہی،بہ شمول خدا اور مصنف۔ظاہر ہے یہاں اشارہ نئی تھیوری کی طرف ہے،جس نے سچائی کو ایک سماجی تشکیل کہا ہے۔سعید اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ’’یہ کہنا سچ ہے کہ معروضیت اور اتھارٹی کی تنقید نے مثبت خدمت انجام دی،کیوں کہ اس تنقید سے یہ واضح ہوا کہ بنی نوع انسان نے کس طرح سیکولر دنیا میں سچائیاں تشکیل دیں‘‘۔یہیں سعید اپنے محبوب موضوع مابعد نو آبادیات کی طرف پلٹتے ہیں،اور کہتے ہیں کہ سفید آدمی کی برتری بھی ایک ’معروضی سچائی‘ سمجھی گئی تھی۔ایشیا و افریقا پر حکم رانی،اسی ’معروضی سچائی‘ کو اتھارٹی سمجھ کر کی گئی۔سعید نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے واضح کیا ہے کہ کس طرح سفید آدمی نے ’ہم‘ کو ایک آفاقی صداقت قرار دے کر مقامی ثقافتوں کا استحصال کیا،حالاں کہ ’ہم‘ خود ایک مقامی یورپی تصور تھا۔اتھارٹی کی تنقید سے آفاقیت معرضِ سوال میں آئی ہے۔آفاقیت کی جگہ مقامیت نے لے لی ہے۔عقلی طور پر مقامیت کا مطلب ہے کہ سچائی غیر معین یعنی contingent ہے۔آج اور یہاں کی سچائی،ضروری نہیں کہ کل اور وہاں کی سچائی کے عین مطابق ہو،یا اس کے لیے معیار ہو۔مطابقت اور معیار بننے کا امکان ہوسکتا ہے،لازمی اصول نہیں۔یہی وہ سچ ہے،جس کا اظہار دانش ور کو طاقت ور کے سامنے کرنا چاہیے۔

عالمی دانش ور کے سامنے اب بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح مقامی شناختوں کو دیگر مقامی شناختوں سے ہم آہنگ کیا جائے؟ اس ضمن میں وہ ایک اہم بات یہ کہتے ہیں کہ آج کسی دانش ور کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنی ثقافت کی شان وشوکت کے قصیدے لکھے۔یہ قصیدے دوسری،مختلف ثقافتوں کی موجودگی میں کوئی جواز نہیں رکھتے۔اپنی ثقافتی عظمت کا ترانہ،دوسری ثقافتوں سے ہم آہنگی میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔سعید دانش ور کو ثقافتی سفیر کے طور پر نہیں دیکھتے۔ان کی نظر میں دانش ور کے لیے معقول رویہ،یہ ہے کہ وہ اپنے اور دیگر معاشروں میں موجود اختیارات کی حامل ان طاقتوں کو موضوع بنائے جو اپنے شہریوں کو جواب دہ ہیں۔طاقت کو موضوع بنانے،اس کی حکمت عملیوں اور ان کے اثرات کو منکشف کے لیے ضروری ہے کہ دانش ور غیر معمولی تحقیق اور سخت محنت کرے۔وہ ان دانش وروں کو ملامت کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے تو اصولی اور مشکل مئوقف اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں،مگر خود اس سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں ان پر سیاسی ہونے کی چھاپ نہ لگ جائے،یا جو متنازع ہونے سے ڈرتے ہیں۔نیز وہ متوازن،معتدل ہونے کی شہرت چاہتے ہیں،یا یہ خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں کسی باوقار بورڈ میں شامل کرلیا جائے،وہ فیصلہ سازوں کی مین سٹریم میں رہیں،اور امید رکھیں کہ انھیں کوئی اعزازی ڈگری مل جائے،کوئی بڑا انعام یا شاید سفارت۔سعید کے نزدیک دانش ور کے لیے اگر کوئی شے اس کی پر جوش دانش ورانہ زندگی کی خاصیت بدل سکتی ہے،اسے بے اثر اور بالآخر اسے قتل کرنے والی ہوسکتی ہے تو ان عادات کو ’داخلی بنانا‘ ہے۔دانش ور کے خوف اور ترغیبات ،اس کی ذہنی زندگی کو زہر آلود کرتے ہیں،جس کا اثر اس کی تحریروں میں بھی ظاہر ہوتا ہے؛وہ طاقت کے آگے کلمہ ءحق کہنے کی بجائے

،طاقت کی رضامندی کا طالب رہنے لگتا ،اور مشکل وقت پڑنے پر طاقت کی آئیڈیالوجی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔تاہم سعید یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ طاقت کے سامنے اظہار کوئی سادہ لوح قسم کی مثالیت پسندی نہیں۔بہ قول سعید دانش ور کا کلمہ حق دراصل متبادلات کا محتاط جائزہ ہے،یعنی صحیح بات کا انتخاب ،اور اس کی قابل فہم انداز میں نمائندگی،اور اس پلیٹ فارم سے نمائندگی جہاں یہ زیادہ مؤثر ہو اور صحیح تبدیلی کا سبب بن سکے۔

ان خطبات میں سعید اس مؤقف کو کئی بار دہراتے ہیں کہ دانش ورانہ سرگرمی،سیاست سے الگ نہیں رہ سکتی۔سیاست ہر شے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔یہ سعید کا پسندیدہ مقولہ لگتا ہے۔نیز وہ دانش ور کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ تبدیلی کے عمل کا حصہ بھی بنے۔ایسے میں اس بات کا امکان ہے کہ دانش ور کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائے،لیکن ساتھ ہی سعید اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کی جماعت میں شمولیت اسے دانش ور کی بجائے جماعتی نظریے کا معتقد بنا سکتی ہے۔اس سوال پر وہ بحث اپنے آخری خطبے ''دیوتا جو سدا ناکام ہوتے ہیں'' میں کرتے ہیں۔خطبے کا یہ عنوان انھوں نے رچرڈ کراس مین کی کتاب *The God that Failed* (مطبوعہ ۱۹۴۹) سے لیا ہے۔

ایک دانش ور کے طور پر سعید کسی دیوتا میں یقین نہیں رکھتے۔لکھتے ہیں: ''میں کسی بھی قسم کے سیاسی دیوتا میں اعتقاد کے خلاف ہوں''۔سعید بعض تاریخی مثالوں سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سیاسی دیوتاؤں میں دانش ور کے اعتقاد کا انجام بالآخر اعتراف گناہ کی اذیت ہے۔وہ اپنے ایک ایرانی دوست کی کہانی لکھتے ہیں،جو خمینی انقلاب کا پر جوش حامی تھا۔انقلاب کے بعد خمینی حکومت کا حصہ بنا،بعد میں مایوس ہوا۔جب اسلامی انقلاب کے ممکنہ نتائج سامنے نہیں آئے،تو وہ امریکا آ گیا۔یہی نہیں بلکہ خلیج کی جنگ کے دوران میں اس نے امریکا کی حمایت بھی کی۔گویا ایک دیوتا سے مایوس ہو کر،دوسرے دیوتا میں اعتقاد پختہ کر لیا۔ بہ قول سعید اس کا رویہ،بائیں بازو کے یورپی دانش وروں کا سا تھا،جو فاشزم اور امپیریل ازم میں سے امپیریل ازم کا انتخاب کرتے ہیں۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''دانش ورانہ اور سیاسی طور پر مطلوب رویہ،یہ تھا کہ فاشزم اور امپیریل ازم دونوں کو رد کیا جاتا''۔برصغیر کے بائیں بازو کے دانش وروں نے بھی دوسری عالمی جنگ کے دوران میں فاشزم کے مقابلے میں برطانوی امپیریل ازم کا ساتھ دیا تھا۔سعید نے یہ واضح نہیں کیا کہ بائیں بازو کے یورپی دانش وروں نے فاشزم کی مخالفت میں کیوں امپیریل ازم کا انتخاب کیا؟بائیں بازو کے یورپی دانش ور ہوں یا برصغیر کے،ان کی فکر طاقت کی حرکیات میں اسیر تھی؛ان کے لیے یہ بات قابل فہم تھی کہ طاقت کی ایک سفاک شکل کا خاتمہ،طاقت کی دوسری زبردست صورت سے کیا جا سکتا ہے۔ایک طاقت کے مقابلے میں دوسری طاقت کے انتخاب کا 'جبر'، دوسری عالمی جنگ (جس میں فاشسٹ جرمنی و اٹلی کے مقابلے میں اتحادی ملکوں میں سوویت یونین بھی شامل تھا،جو بائیں بازو کی جماعتوں کی دانش ورانہ فکر کا قبلہ تھا) کی پیداوار تھا۔سوال یہ ہے کہ اس میں آج کے دانش ور کے لیے کیا پیغام ہے؟ہماری رائے میں بڑا سادہ پیغام ہے۔دانش ور کو طاقت کے مراکز سے فاصلہ رکھنا چاہیے،تاکہ وہ طاقت،جبر،استحصال کی واضح اور مخفی یعنی مادی،نفسیاتی اور علمیاتی صورتوں کا پردہ چاک کر سکے۔یہ دانش ور کا حاشیائی مقام ہے،مگر اس کی دانش کی ساری طاقت کا خزینہ یہیں دفن ہے۔

رچرڈ کراس مین کی کتاب میں ممتاز مغربی دانش وروں،جیسے آندرے ژید،آرتھر کوئسلر کے ماسکو کی طرف جانے اور پھر واپس غیر کیمونسٹ ملکوں میں آ کر 'اعتراف گناہ' کے قصے ہیں۔بہ قول سعید سرد جنگ کے زمانے میں اکثر لوگوں کے 'دانش ورانہ کیریر' کی بنیاد دانش ورانہ کامیابیوں کے بجائے کیمونزم کی برائیوں کو ثابت کرنے،نیز کیمونسٹ ملکوں میں جا کر رہنے کے ناکام تجربے پر ندامت کے اظہار پر تھی۔اس پر سعید طنزاً کہتے ہیں: ''میں پوچھنا چاہتا ہوں،ایک دانش ور کے طور پر آپ کیوں دیوتا میں یقین رکھتے ہیں؟مزید براں آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ آپ کا سابقہ اعتقاد اور بعد کی التباس شکنی [ہمارے لیے] اس قدر اہم ہیں؟''سعید دیوتا میں یقین کو تشدد سے وابستہ دیکھتے ہیں۔نئے نظریے کو مذہب بنانے والے،اور پرانے نظریے کی طرف مراجعت کرنے والے اکثر عدم رواداد اور متشدد ہوتے ہیں۔قصہ مختصر،دانش ور کے لیے دیوتا ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔

دیوتا کیوں ناکام ہوتے ہیں؟دیوتا (اور ہیرو بھی)،ایک ایسی شبیہ ہے،جس کی اصل ہمیشہ ماضی میں ہوتی ہے،مگر یہ حال میں پوری شان سے جلوہ گر رہتی اور مستقبل سے متعلق امیدوں اور خواہشات کا مرکز بنی رہتی ہے؛گویا یہ لازمانی شبیہ ہے،جس کا تصور ہم اپنے اس ذہن سے کرتے ہیں،جس کی ساری کارکردگی زمان و مکاں کی اسیر ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیوتا کو اپنی عقیدت کا مرکز بنانے کے لیے ہم اپنے مکانی و زمانی شعور کو معطل کرتے ہیں۔

[دانش ور کے اظہارات (*Representations of the Intellectual*) ونٹاژ بکس،نیو یارک سے ۱۹۹۴ میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی۔اس تحریر میں کتاب کا پہلا ایڈیشن ہی سامنے رکھا گیا ہے۔ن ع ن]

اُردو زبان میں محاورات کا غلط استعمال

حیات عبداللہ

۲ جولائی کے ''خبریں'' میں ''اُردو زبان میں محاورات کا غلط استعمال'' کے عنوان سے محترم حیات عبداللہ کا کالم نظر سے گزرا۔ ایک محبت کرنے والے کا پیغام ملا کہ اس پر کچھ لکھنا چاہیے۔ ہم دوسروں کی حوصلہ افزائی پر جوتا اور ڈنڈا تو آسانی سے اُٹھا لیتے ہیں لیکن قلم اُٹھانا ہماری جان نکالتا ہے۔ لیکن ہم اس لیے بھی جوش میں آ گئے اور لکھنے کی ٹھان لی کہ مولانا حیات عبداللہ کے کالم میں یقینی طور پر بہت سے ایسے نکات ہیں کہ جن کی درستی اور اصلاح ضروری ہے۔ (ڈاکٹر عاصم ثقلین)

قارئین کے لیے دونوں مضامین ''ارژنگ'' میں ایک ساتھ شامل کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے بعض محاورے، ضرب الامثال اور الفاظ ایسے ہیں جنھیں ہم بے خبری اور لاعلمی میں استعمال کر جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے مطالب و مفاہیم پر تھوڑا سا بھی غور یا نظر ثانی کر لی جائے تو اصل صورت حال فوراً ہی ذہن میں آ جاتی ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ اور محاورے ایسے ہیں کہ جن کا استعمال لاشعوری طور پر دین اسلام کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے مگر لوگ ان کے پس منظر میں موجود دین اسلام سے بیگانہ کر دینے والے معانی کو مکمل نظر انداز کر کے اپنے مطلب سے غرض رکھتے ہوئے انھیں بے دھڑک استعمال کرتے چلے جاتے ہیں اور ذرا ٹھہر کر نہیں سوچتے کہ ان کے استعمال سے ایمان پر بھی زد پڑ سکتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ کسی خوش خبری ملنے کی صورت میں بڑی دیدہ دلیری سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی'' ایسا بولنے والے کو خبر ہی نہیں کہ دیوی اور دیوتاؤں کا تصور تو ہندو مذہب کی اختراع ہے۔ اسے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا مگر وہ اسے دیوی اور دیوتاؤں کی نوازش اور مہربانی سمجھ کر انتہائی نامناسب لفظ ادا کر رہا ہے۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ نماز بخشوانے گئے روزے گلے پڑ گئے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک اور لکھے موسیٰ پڑھے خدا۔ ایسے محاورے ہیں جن سے میرے خیال میں شعائرِ اسلام کی توہین ہوتی ہے مگر مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے جا رہے ہیں؟ آیئے! ذرا دیکھئے محاوروں کا غلط استعمال کس کس انداز میں کیا جا رہا ہے؟

حاتم طائی کی قبر پر لات مارنا، اس کا معنی ہے سخاوت میں حاتم طائی کو مات دے دینا، اگر کوئی آدمی بہت زیادہ سخاوت کا مظاہرہ کرے تو اس کے لیے بھی یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے یا اگر کوئی کنجوس آدمی بھی سخاوت کر بیٹھے تو اس کے لیے بھی طنزاً یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر ذرا رک کر سوچیے کہ قبر پر لات مارنا کتنا گناہ ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے تو قبر پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے اور قبر کے اوپر چلنے کی بھی شدید وعید آئی ہے مگر یہاں تو قبر پر لات مارنے کا عندیہ دیا جا رہا ہے۔

قبلہ درست کرنا۔ اگر کوئی شخص اپنی اُلٹی حرکتوں سے باز نہ آئے تو کہتے ہیں کہ اس کا قبلہ درست کرنا پڑے گا۔ حالاں کہ قبلہ نہ تو غلط جگہ پر واقع ہے اور نہ اسے درست کرنے کی ضرورت۔ یاد رکھیے قبلہ بالکل درست جگہ پر ہے اسے درست کرنے کی کوشش مت کیجیے۔

بغل میں چھری منہ میں رام رام، یہ ضرب المثل ہے جو ظاہری دوست اور باطنی طور پر دشمن کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے کسی بھی مسلمان کے لیے استعمال نہ کیجیے کیوں کہ اپنے مسلمان بھائی کو منافق کہنا اور سمجھنا کسی طور صحیح نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مسلمان رام رام نہیں کرتے بلکہ اللہ کو اس کے پاکیزہ ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا، گنگا ہندوؤں کا ایک مشہور اور مقدس دریا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس میں اشنان (غسل) کرنے سے پاپ (گناہ) دھل جاتے ہیں۔ ہندو اس دریا میں اپنے جلائے گئے مردوں کی راکھ ڈالنا باعث نجات سمجھتے ہیں اسی مناسبت سے گنگا میں ہاتھ دھونا اور گنگا بہانا جیسے محاورے ایجاد کیے گئے۔ اول الذکر کا معنی ''فیض حاصل کرنا'' اور موخر الذکر کا مطلب ''فیض جاری کرنا'' ہے۔ بہتر ہے کہ ہندو تہذیب کے آئینہ داران محاوروں کو ترک کر دیا جائے۔ یاد رکھیں مسلمانوں کا مقدس پانی آبِ زم زم ہے۔

ساجھے کی ماں بھی بری، کسی چیز یا کسی کاروبار میں شراکت سے بچنے کے لیے محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ ساجھے کی تو ماں بھی بری ہوتی ہے۔ کسی ماں کی اولاد اگر ایک سے زیادہ ہو گی تو یقینی بات ہے کہ ماں بھی ساجھے ہی کی ہو گی۔ اکثر مائیں ساجھے ہی کی ہوتی ہیں۔ ماں جیسے مقدس رشتے کا یہ کس قدر استہزا اور توہین ہے کہ وہ اگر ساجھے کی ہو گی تو بری ہو گی۔ اسلام نے تو والدین کے بہت زیادہ حقوق بیان فرمائے ہیں۔ بڑھاپے میں انھیں اُف تک کہنے سے روکا ہے۔ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ نے فرمایا تیری ماں کا، اس نے پھر یہی پوچھا آپ نے پھر یہی جواب دیا کہ تیری ماں کا۔ اس نے تیسری بار یہی سوال پوچھا تو آپ نے پھر بھی یہی جواب دیا۔ جب اس شخص نے چوتھی مرتبہ یہی سوال دریافت کیا تو آپ نے فرمایا تیرے باپ کا۔ (صحیح مسلم)

ظلم خدا کا: کسی آدمی کو اگر غصہ آئے یا کسی کا کام یا حرکت پسند نہ آئے تو فوراً کہا جاتا ہے ''ظلم خدا کا'' یہ جملہ کہنا قطعاً درست نہیں۔ اس لیے کہ اللہ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کی ذات تو رحمت ہی رحمت ہے۔ وہ تو کافروں کو ان کے کفر کے باوجود بھی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اگر اللہ کسی کو پریشانی میں بھی مبتلا کرتا ہے تو یہ بھی اس کے گناہوں کے خاتمے اور اس کے اجر و ثواب میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ ''میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا'' (سورہ ق) لیکن ہمارے ہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ''ظلم خدا کا یا غضب خدا کا'' بول دیا جاتا ہے۔

اُردو محاورات کا استعمال

ڈاکٹر عاصم ثقلین

یہ امر لاریب ہے کہ فاضل کالم نگار اسلام اور شعائرِ اسلام سے بے حد اور والہانہ محبت کرتے ہیں جو اُن کی ہر سطر سے عیاں ہے۔اسی پُر جوش محبت میں انہوں نے اُردو محاورہ اور ضرب الامثال پر کچھ ایسے اعتراضات کر ڈالے ہیں جن میں سراسر جذباتیت کی کارفرمائی نمایاں اور منطق و دلیل کا اثر عنقا ہے۔اس کے علاوہ اُردو زبان و محاورہ سے مصنف کی آشنائی کا فقدان بھی واضح ہے۔یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ جہاں جہاں مصنف نے اپنی ''علمیت'' کے اظہار کے لیے دلائل سے کام لیا ہے وہاں وہاں اُن کی تحریر مزید طفلانہ و ''معصومانہ'' ہو گئی ہے۔

یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے کہ اُردو زبان کئی مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے اثرات اپنے جلو میں اٹھائے ہوئے ہے۔اس زبان کی بنت میں عربی، فارسی کے علاوہ دیگر کئی زبانوں کا نمایاں حصہ ہے اور اِن زبانوں کے مختلف النوع اثرات اُردو کے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔اس کی نشو ونما میں ہندوستان کی تمام تہذیبوں کی جلوہ نمائی کے ساتھ ساتھ ہندی کا بہت بڑا حصہ ہے اور بہت سی ایسی ضرب الامثال اور متعدد محاورات موجود ہیں جن کی تشکیل ہندو معاشرے میں ہوئی۔ ''بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا'' اور ''قسمت کی دیوی کا مہربان ہونا'' کو ایسی ہی مثالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔فاضل مصنف کا یہ کہنا بالکل درست بلکہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ دیوی دیوتاؤں کا تصور مشرکانہ ہے اور ہندوؤں کی اختراع ہے لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ محاورات بھی ایسے مقامات کے وضع کردہ ہوں جہاں ہندو اکثریت ہو۔زبان وضع کرنے والی تہذیب یا علاقہ ہندو یا مسلمان ہو سکتا ہے مگر زبان بذاتِ خود نہ تو ہندو ہوتی ہے نہ مسلمان۔اس لیے محاورات اور ضرب الامثال کو بھی اپنے ساتھ مسلمان کر لینے کا جوش ذرا سا مبالغہ آمیز ہے۔یہ بات بھی غور طلب ہے کہ محاورہ بھی اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔محاورے کے الفاظ اپنے اصل معنی نہیں دیتے بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لہٰذا ان کے حقیقی معنی سے نفرت کا رویہ طفلانہ جوش کی پیداوار ہے۔

''بغل میں چھری منہ میں رام رام'' پر بھی مصنف کا اعتراض بالکل بے جا ہے۔ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ضرب المثل یقیناً کسی مسلمان کی وضع کردہ ہے کیوں کہ اس سے کسی منافق مسلمان کا نہیں بلکہ چالاک و مکار ہندو کا تصور سامنے آتا ہے۔فاضل مصنف کی اسلام سے جوشیلی محبت اپنی جگہ لیکن ہم تو کسی ایسے آدمی کی زبان سے اسلامی اذکار سننے کے خواہاں ہرگز نہیں ہیں جس کی بغل میں چھری ہو۔

اب ذرا ''لکھے موسیٰ پڑھے خدا'' کا قصہ سنیے کہ کالم نگار کو اس میں موسیٰ اور خدا کی توہین نظر آ گئی ہے۔یہ بات اُردو جاننے والے لوگوں کے لیے نئی نہیں کہ اس ضرب المثل کے الفاظ اپنے صوتی آہنگ کے سبب تبدیل ہو گئے۔دراصل یہ مثل ''لکھے مُو سا پڑھے خود آ'' تھی۔مراد یہ کہ جو شخص مُو (بال) جیسے باریک اور چھوٹے چھوٹے الفاظ لکھتا ہو وہ اپنا لکھا خود ہی سمجھ سکتا ہے۔یہ مثل ایسے فرد کے لیے بولی جاتی ہے جس کی تحریر سمجھ نہ آتی ہو۔مزید یہ کہ اسے اگر ''لکھے موسیٰ پڑھے خدا'' بھی مان لیا جائے تو اس میں کسی توہین کا پہلو کہاں اور کیسے نکلتا ہے۔ظاہر ہے کہ موسیٰ جیسی جلیل القدر ہستی کی الہام اور معرفت سے بھرپور تحریر (اگر کوئی ہو) تو اسے مکمل طور پر خدا ہی سمجھ سکتا ہے۔

محاورہ ''قبلہ درست کرنا'' میں لفظ ''قبلہ'' سے مراد کعبہ نہیں بلکہ سمتِ کعبہ ہے۔لغات میں اس لفظ کے یہ معنی فوقیت کے ساتھ درج ہیں کہ ''قبلہ'' اور ''مقابل'' کا مادہ ایک ہی ہے۔یہ محاورہ ایسے فرد کے لیے بولا جاتا ہے کہ جس کے عمل کی سمت درست نہ ہو۔جیسے کوئی مسلمان لاعلمی کی حالت میں کعبہ کے علاوہ کسی اور سمت کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے تو اُسے کہا جائے گا: ''جناب! اپنا قبلہ درست کیجیے۔'' اس سے مراد اس فرد کی سمت درست کرنا ہوگا۔یہ معنی ہرگز ہرگز نہ ہوں گے کہ آپ خانہ کعبہ ہی کو درست کیجیے (نعوذُ باللہ!)۔کتنی پُر لطف بات ہے کہ فاضل کالم نگار کو لوگوں کے قبلہ درست کرنے پر بھی اعتراض ہے حالاں کہ ہم سے کوئی پوچھے تو ہم دست بستہ اسی محاورے کا اطلاق خود اُنہی پر بالجبر کرانے کا حکم صادر فرما دیں۔

''حاتم کی قبر پر لات مارنا'' بھی محاورہ ہے۔جس سے مراد بدیہی طور پر کسی کی قبر کو پیٹنا یا اس کی گستاخی کرنا نہیں بلکہ کسی کنجوس آدمی سے لاشعوری طور پر کوئی سخاوت کا کام وقوع پذیر ہونا ہے۔مضحکہ خیز امر ہے کہ کوئی کسی محاورے کے الفاظ کے حقیقی معنی میں گستاخانہ پہلو نکال لے۔فاضل مصنف نے بالکل اسی نہج پر چلتے ہوئے ایک اور ضرب المثل ''ساجھے کی ماں بھی بُری'' میں ماں کی گستاخی کے پہلو نکال کے فضیلت والدین پر تقریر جھاڑ دی ہے۔اگر صاحبِ مضمون ذرا غور فرما لیتے تو انہیں اسی مثل میں ماں کے رشتے کی ذم کی بجائے ساجھے یعنی شراکت کی برائی صاف نظر آ سکتی تھی۔اس مثل کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ ماں میں بُرائی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اور یہ رشتہ بہر صورت خوب صورت اور عظیم ہے لیکن یہی بے حد معتبر رشتہ بھی اگر ساجھے کا ہو تو اس میں خرابی کے کئی پہلو نکل آتے ہیں۔

معروف لطیفہ ہے کہ کسی شاعر سے شعر سننے کے لیے کسی باذوق سامع اور مداح نے ''ارشاد، ارشاد!'' کہا تو شاعر اسے یہ کہہ کر پیٹنے لگا کہ ''تجھے میرے سامنے یہ نام لینے کی جرات کیسے ہوئی۔ارشاد تو میری مطلقہ بیوی کے دوسرے شوہر کا نام ہے!''۔ہمیں عرض بس اتنا ہی کرنا ہے کہ خدارا لفظ و معنی کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے اور خواہ مخواہ کی لٹھ اُٹھائے اُردو کا ستیاناس مت کیجیے کہ یہ بے چارہ و بےبس زبان پہلے ہی زخم زخم ہے۔

اے سیّد لولاک ﷺ

محمد نوید مرزا/لاہور

نعت کہنا ایک ایسی سعادت ہے جو کسی صاحب کمال اور خوش قسمت شاعر کے ہی حصے میں آتی ہے۔ حضور اکرمؐ فخرِ انسانیت ہیں۔ ہم ان کے اُمتی ہیں۔ وہ آقا ہیں اور ہم غلام ہیں۔ لہٰذا غلاموں کا آپؐ کی شانِ اقدس میں لفظوں کو چن چن کر پیش کرنا اور گلہائے عقیدت کے موتی ایک مالا میں پرو کر نہایت سلیقے اور طریقے سے پرو کر لانا مقدر والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ نعت پر تحقیق کرنے والوں کے مطابق نعت لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔

ہمارے محمد امین ساجد سعیدی اس سفر پر تن تنہا نکل پڑے ہیں اور انہوں نے یہ پل صراط پار بھی کر لیا ہے۔ امین صاحب کے پہلے نعتیہ مجموعے ''مدینہ یاد آتا ہے'' پر انہیں وزارتِ مذہبی امور سے صدارتی سیرت ایوارڈ مل چکا ہے۔ جو ان کے مستند نعت گو شاعر ہونے کی گواہی ہے۔ حال ہی میں ان کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''اے سیّد لولاک'' منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس میں حمد و نعت کی بہاریں چاروں طرف اپنی ''خوشبو'' پھیلا رہی ہیں۔ ''اے سید لولاک'' کے بارے میں ڈاکٹر محمد امین اپنے خوبصورت مضمون میں لکھتے ہیں ''اے سیّد لولاک'' کے مطالعے سے ایک خاص بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں ردیف کا استعمال بہت خوبصورت اور بامعنی ہے۔ مصرعہ مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہو جاتا ہے اور ردیف اس کو اور بامعنی بنا دیتی ہے۔ یہ خطابیہ انداز ہے اس طرح فنِ خطابت کے اس اصول کو بھی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اب مستزاد کی صنعت کا استعمال نہیں رہا۔ کم ہی کسی شاعر میں نظر آتا ہے۔ ردیف کی شکل میں مستزاد کا استعمال بہت خوبصورت اور بامعنی ہے۔ اس سے شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے اور موسیقیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ کی روشنی میں ساجد صاحب کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ان کے ہاں نعت پورے فنی اور شعری محاسن کے ساتھ جلوہ افروز دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ کتاب میں چار حمدوں کے بعد نعتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ''اے سیّد لولاک'' کی خاص بات یہ بھی ہے کہ ہر حمد اور نعت کو کوئی نہ کوئی خوبصورت عنوان دیا گیا ہے جو کہ نعت گوئی کی تاریخ میں قدرے مختلف اور نیا تجربہ ہے۔ ممکن ہے ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہو، مگر میری نظر میں اس طرز کی یہ پہلی نعتیہ کتاب ہے۔ شاعر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس نے اظہارِ عقیدت کے لیے لفظوں کے چناؤ میں بڑی ریاضت اور محنت کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں ردیفیں نئی اور مختلف ہیں۔ کلام میں سادگی، بے ساختگی، روانی اور پختگی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام مترنم بحروں میں ہے جس سے ہمارے نعت خواں حضرات بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بقول سید حامد سعید کاظمی، عزیزم! امین ساجد سعیدی نعت گو شاعر ہیں۔ اس میدان میں ندرتِ خیال اور جودتِ طبع کو منوانے کے مواقع تو میسر نہیں ہوتے لیکن سادہ ترین الفاظ میں اپنی غلامی کے اقرار میں جو سکون ملتا ہے وہی سب سے بڑا صلہ اور سب سے بڑا انعام ہے۔ رب کریم اپنی اور محبوب کریم کی بارگاہ میں یہ عقیدت و محبت کے پھول قبول و منظور فرمائے۔ آمین

حامد صاحب کی اس معتبر رائے کے بعد ہم پر امین ساجد صاحب کی نعت کے حوالے سے کئی نئے در کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مشکل تشبیہ و استعارات کی بجائے سادہ لفظی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ دراصل سادگی ہی ایک ایسا وصف ہے، جو پڑھنے اور سننے والوں کے دل پر اثر کرتا ہے۔ آیئے اب ان کی اس شعری خوبصورتی کی چند مثالیں دیکھتے ہیں:

مجھے دیدار ہو جائے، تو بیڑہ پار ہو جائے
کرم سرکار ہو جائے تو بیڑہ پار ہو جائے

رسول پاک کی سیرت کے پرانوار گوشوں سے
یہ دل ضوبار ہو جائے، تو بیڑہ پار ہو جائے

اشکوں سے دل ہے بہلایا، جب شہر مدینہ یاد آیا
اک کیف سکوں سا ہے پایا، جب شہر مدینہ یاد آیا

ساجد کے کچھ پاس نہیں ہے، آس نہیں ہے
قبر میں ہے بس ایک حوالہ، کملی والا

نعت لکھتا رہا ان کی ساجد امیں، دلربا دلنشیں
جن کے صادق امیں خوب کردار ہیں شاہِ ابرار ہیں

صحنِ اقصیٰ کے در و بام پکارے، سن لو
سارے نبیوں سے نرالا ہے، مدینے والا

خواب میں آ گئے جب وہ حسنِ ازل پیکر بے بدل
ان کے قدموں میں، میں گرتا پڑتا رہا، نعت پڑھتا رہا

آپ نے دیکھا ان سارے شعروں میں عقیدت و محبت کی خوشبو رچی بسی ہے۔ میں ''اے سید لولاک'' کی اشاعت پر شاعر کو مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی مزید شعری کاوشوں کے لیے دعا گو ہوں۔ آخر میں اس کتاب کے ناشر اور معروف شاعر جناب حسن عباسی کی ساجد صاحب کی شاعری کے بارے میں چند سطریں آپ کے لیے پیش کر کے اجازت چاہوں گا۔ وہ اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد امین ساجد سعیدی محبت اور خلوص کا پیکر ہے۔ وہ دوستی کی ہر تعریف پر پورا اُترتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ آقائے دو جہاں حضرت محمدؐ کی مدح سرائی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ عشقِ نبیؐ میں سانس لیتا ہے۔ ان کی غلامی میں سانس لیتا ہے۔ ان کی غلامی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اور ان کا اُمتی ہونے پر نازاں رہتا ہے۔ وہ حاصل پور میں رہ کر ہر وقت مدینے کی ہوا کو اپنے چاروں طرف محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اس کے چہرے کی شادابی اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر تازگی ملتی ہے۔''

اللہ پاک امین صاحب کے چہرے کی یہ تازگی تاحیات قائم رکھیں اور وہ اسی طرح خوبصورت نعتیں لکھتے رہیں۔ آمین

گمشدہ سائے

علامہ عبدالستار عاصم

جدید افسانہ نگاروں میں روبینہ فیصل امتیازی حیثیت کی خاتون افسانہ نگار رہیں۔ ان کے فکر انگیز افسانوں کا تازہ مجموعہ ''گمشدہ سائے'' ایسے فن پاروں کا ذخیرہ ہے جس میں حیرت اور تجسس کے سحر آمیز کیفیت قاری کو اس کھوج کے راستے پر ڈالتی ہے جو شعور اور آگہی کی منزل تک بھی لے جاتا ہے، اور اس کیفیت کی مستی اسے ایک نئے جہان کی ایسی فضا کے دل آویز طلسم سے بھی آشنا کرتی ہے جو اپنی ذات کے دائمی حصار سے نکل کر معاشرے اور سماج کے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے پر اکساتی ہے۔ نفسیاتی تجزیے کی باریکیاں، گہرا مشاہدہ اور جذبوں کی شدت روبینہ کے افسانوں کا خاص وصف ہے ۔ یہ اسلوب واقعاتی حادثاتی یا علاماتی کہانیوں میں اگر حیرت کا محرک نہ بھی بنے تو دعوت فکر کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔ موضوع کی ندرت اور قلم کی بے باکی روبینہ فیصل کو بحیثیت افسانہ نگار ایک الگ مقام پر کھڑا کرتی ہے۔ ''گمشدہ سائے'' پڑھتے ہوئے اس کے نہایت جرأت مندانہ اسلوب سے یہ امید بجا طور پر بہت مضبوط اور قوی ہو جاتی ہے کہ وہ آئندہ اس سے بھی عظیم تر فن پارے تخلیق کرے گی۔ اردو ادب میں نمایاں اور بلند مقام اب اس کی دسترس سے قطعی طور پر دور نہیں ہے۔

''گمشدہ سائے'' کا ہر افسانہ فن کارانہ دیانت اور جامعیت کا اچھوتا شاہکار ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان لکھتے ہیں:

''عزیزی روبینہ فیصل کی درجن بھر کہانیوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہے! پھر یہ کہ بعض کہانیاں مختصر ترین ہیں جو ایک صفحے پر محیط ہیں، البتہ مفہومی اعتبار سے مکمل اور بھرپور ہیں۔ بعض چونکا دینے والے جملے جو پوری پوری کہانی دکھائی دیتے ہیں مثلاً ''شیری اور ہاف بلائنڈ گورا'' میں وہ لکھتی ہیں کہ'' آج میں اتنی مضبوط ہو گئی ہوں کہ ایک مرد کو دھوکہ دینے کی طاقت رکھتی ہوں''۔ ''گم شدہ سائے میں زیر لب تبسم اور حیرت انگیز تجسس جا بجا پیغام کی صورت میں پڑھنے کو ملتا ہے''۔

اصغر ندیم سید خود کہانی کار ہیں، وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور پرکھتے ہیں، ان کے نزدیک کہانی کے ساتھ چل کر ہی کہانی لکھی جا سکتی ہے وہ روبینہ فیصل کے افسانوں کا پوسٹ مارٹم اس طرح کرتے ہیں:

''جہاں تک ان افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے یہ عام زندگی کے تجربات اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کے پیچھے چھپے ہوئے کرداروں اور اُن کی محرومیوں اور کمزوریوں سے جنم لیتے ہیں۔ اپنا اپنا جہنم ان کرداروں کا مقدر ہے۔ روبینہ فیصل نے عصری حسیت کے ذریعے ان کرداروں کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ کردار کیا ہیں؟ چلتی پھرتی زندگی ہیں۔ کینیڈا میں بوڑھی مقامی عورتیں جو کتوں سے بندھی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یا چرس کا سگریٹ پیتی پاکستانی بڑھیا جو بہت سے بھید سنبھالے بیٹھی ہے دونوں کرداروں میں صرف براعظم کا فرق ہے۔ اندر سے ملال ایک جیسا ہے۔ شیری کی زندگی کی کروٹیں ہوں یا یاسمین کی خود فریبی کا لبادہ ہر جگہ روبینہ فیصل کے مشاہدے نے ہمیں ایسے تجربوں سے آشنا کیا ہے۔ جو انوکھے بھی ہیں اور منفرد بھی لگتے ہیں۔

''شاعر کی بیوی'' ایسا افسانہ ہے جس میں ہمارے شاعروں کی حسرتیں، ناکامیاں اور جذباتی ناآسودگیاں بہت باریکی سے بے نقاب ہوئی ہیں۔

ہر افسانہ اچھوتے مسئلے کو سادہ اور سچے بیانیہ کے ساتھ پیش کرتا ہے جس سے تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ روبینہ فیصل کا یہی انداز ہی اُن کی کامیابی کی دلیل ہے کہ یہ افسانے خود کو پڑھواتے ہیں۔ ہر کہانی آپ کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے''۔

بزرگ ادیب، شاعر اور کالم نگار ڈاکٹر اجمل نیازی (ستارہ امتیاز) منفرد لب و لہجہ اور تحریر رکھتے ہیں، ان کے یہ چند فقرے ''گمشدہ سائے'' میں جہان معنی کی جانب توجہ دلاتے ہیں:

''پتہ نہیں کیوں مجھے " گمشدہ " کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے کوئی گمشدہ خواہش تمنا یا آرزو، جب کوئی گمشدہ چیز، خواہش یا دوست اچانک مل جائے تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ " گمشدہ سائے" روبینہ فیصل کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے، روبینہ فیصل ایک مختلف اور ممتاز افسانہ نگار ہے بلکہ میں اسے ایک گمشدہ افسانہ نگار کہوں گا جسے اردو ادب نے تلاش کر لیا ہے۔" گمشدہ سائے" کے ہر افسانے میں ایک نامعلوم کھوئی کھوئی سے گمشدہ

کیفیت قاری کو مطالعے کے سائے میں ستانے پر مجبور کرتی ہے، یہی " گمشدگی" کی کیفیت غم زدگی میں بدل جاتی ہے۔" گمشدہ سائے " کا قاری کسی ایسی کیفیت میں الجھ جاتا ہے، جس میں سایوں کا جھرمٹ تو ہے لیکن چھاؤں نہیں ہے"۔

امجد اسلام امجد روبینہ فیصل کے انداز تحریر کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"روبینہ فیصل کی کہانیوں کی پہلی کتاب کی اشاعت پر بھی میں نے اُن کی کہانیوں کے موضوعات کے مشاہدے اور انداز تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مستقبل میں اُن سے اس سے بھی بہتر کی توقع ہے سو سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ نہ صرف یہ توقع پوری ہوئی بلکہ اس کہانی کار کے کچھ ایسے جوہر بھی کھلے جو اس سے قبل بہت زیادہ نمایاں نہیں تھے۔ وطن اور ادبی مراکز سے دوری کے باوجود روبینہ نے جس طرح سے اپنی مہکی ہوئی دنیا کے مانوس اور کچھ کینیڈا کے شب و روز سے مخصوص گوشوں کو دیکھا اور دکھایا ہے وہ بلاشبہ داد تحسین اور گہرے مطالعے کے لائق اور حق دار ہیں کہ ان میں دو مختلف دنیائیں ایک ہی ناظر کے مشاہدے اور تجربے سے اس طرح سے گذری ہیں کہ قاری اپنے آپ کو منظروں میں شامل پاتا ہے"۔

جس شخص کے ایک ہاتھ میں ہر لحہ قلم اور دوسرے میں کتاب رہتی ہے، جو کتاب سے عشق کرتا ہے اور جس کا جی چاہتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں ہوں اور وہ کتاب لکھنے، پڑھنے، کتاب کو سنوارنے اور چھاپنے کا کام عبادت سمجھ کر کرتا ہے اس کا نام ہے علامہ عبدالستار عاصم، جو روبینہ کے افسانوں کے اس مجموعے "گمشدہ سائے کے پبلشر بھی ہیں، وہ روبینہ فیصل کی کتاب شائع کرنے کو اپنے لیے اعزاز قرار دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"روبینہ فیصل نے " گمشدہ سائے " کی صورت میں اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔" گمشدہ سائے "کے افسانے ہمارے معاشرے کی زندہ اور حقیقی کہانیاں ہیں۔ روبینہ فیصل کی کہانیوں کے کردار ہمارے آس پاس چلتے پھرتے، سانس لیتے، ہنستے روتے اور جیتے جاگتے کردار ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں اردو افسانے کا کوئی گمشدہ یا مدفن خزانہ ہے، جسے روبینہ فیصل نے دریافت کرلیا ہے۔ پاکستان میں افسانہ پڑھنے والے اب بھی موجود ہیں اور ان میں بہت بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ روبینہ کے افسانے قاری کے دل کی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور فکر و خیال کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔ میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔ کہ مجھے روبینہ کی اتنی خوبصورت کتاب شائع کرنے کا موقع ملا۔ یہ اعزاز قلم فاؤنڈیشن کے لیے باعث افتخار ہے۔ دعا ہے کہ روبینہ کے قلم کی جولانی و تابانی اسی طرح قائم رہے"۔

حکومتی ایوانوں کے قریب بسے اسلام آباد کے جناب محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

"روبینہ فیصل قلم تھام کر اُس سہمی ہوئی لڑکی جیسی ہو جاتی ہے جس کے کانچ کے دروازے سے مسافر کہانیاں اپنے بھید اندر پھینکتی رہتی ہیں۔ مکار کہانیاں، کم بخت کہانیاں یا پھر اپنے اپنے وجود پر مغرور کہانیاں، اُس کے قلم پر اُترتے ہی فینکس کی طرح جی اُٹھتی ہے۔ روبینہ فیصل کو کسی شاعر کی کہانی لکھنا پڑی یا رام پرشاد کی شیری جیسی بچی کی جو بچی نہیں پوری عورت ہو گئی تھی، یہ کہانی بوکھلائی ہوئی شمسہ کی تھی یا کیموتھراپی کراتی ماریہ کی، ہر کہانی کا متن فکشن کی زبان سے متشکل ہوا ہے۔ رواں اور سادہ۔ کہیں اُلجھاوا یا رکاوٹ نہیں۔ واقعات ایک بہاؤ میں رہتے ہیں اور اپنے اندر کے نہاں معنی اُچھالتے چلے جاتے ہیں"۔

جناب اختر شمار کا شمار ہمارے ملک کے چند گنے چنے اور معروف و مقبول دانشوروں اور صاحب قلم اہل دانش و بینش ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ روبینہ کی زیادہ کتابیں نہیں پڑھ سکے لیکن پھر بھی وہ اس کے فکر و اسلوب کے معترف ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مجھے ان کی کہانیوں میں آج کا معاشرہ سانس لیتا نظر آتا ہے۔ عمیق اور گہرے مشاہدے سے روبینہ فیصل اپنے کرداروں کی نفسیات اور خصائل بھی متشکل کرنے پر قادر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کے موضوع اگرچہ سامنے کے ہیں لیکن اپنے تاثر سے یہ کہانیاں لہو میں گھل جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان میں اداسی اور ملال کی زیریں لہر نمایاں محسوس کی جا سکتی ہے"۔

معروف مصنف، شاعر اور کالم نگار محمد فاروق عزمی روبینہ فیصل کی کہانیوں کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"روبینہ کے افسانوں کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔ جن میں زندگی سانس لیتی ہے، دکھ، دکھ کی طرح ہی محسوس ہوتے ہیں۔ تنہائیاں، اداسیاں اور رفاقتیں بولتی ہیں۔

محبتیں اور نفرتیں زندگی کا دامن تھامے کبھی جینے کا حوصلہ بنتی ہیں اور کبھی موت کی تمنا کرتی نظر آتی ہیں روبینہ میں زندگی کو بہت باریک بینی سے دیکھنے، سمجھنے اور اپنی کہانی کے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی جو صلاحیت اور طاقت موجود ہے اسے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ وہ زندگی کو عام نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ محسوسات، احساسات اور جذبات کا کوئی خاص پیمانہ سامنے رکھ کر دیکھتی جانچتی اور پرکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا قلم نشتر اور ہاتھ ایک ماہر جراح کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ جو معاشرے کے جسم سے لپٹے گلے سڑے سماجی رسم و رواج، خوف ناانصافی اور بے وفائیوں کے ناسوروں کا آپریشن کرتے ہوئے کوئی رو رعایت نہیں برتتی"۔

محقق، دانشور، ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف جناب جبار مرزا نے روبینہ فیصل کی اس نئی کتاب پر مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"گمشدہ سائے" میں بعض کہانیاں محض ایک صفحے کی ہیں اور بہت خوب ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تجرباتی رنگ اور مشاہداتی حسن نمایاں ہے، ہرچند کہ الفاظ کی تنگ دامنی کا احساس گاہے گاہے قاری کو ہوتا ہے مگر کہانی کی بنت اور سادگی اپنے تائیں مائل کیے رکھتی ہے"۔

فیصل عظیم کینیڈا سے رقم طراز ہیں:

"اکثر کہانیوں میں روبینہ کی ذات کہیں نہ کہیں سے در آتی ہے اور اگر کسی کردار میں اس کا اچانک ورود نہ بھی ہو تو بھی کہانی کی کسی کھڑکی، کسی در، کسی روشندان سے جھانکتی افسانہ نگار کی آنکھیں، جذبات کی سطح پر کہانی میں اس کے شامل ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں اور کہانی اپنی مصنفہ پر ایسے طاری نظر آتی ہے جیسے وہ کہانی بھی اسی کی ہو"۔

سید حسین حیدر روبینہ کو ایک باصلاحیت مصنف کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کی نثری تخلیقات کے معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"کالم نگاری کی بدولت ان کے مشاہدے کی جو وسعت ہے وہ ان کو اور افسانہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ کردار ہو، پلاٹ ہو، کسی واقعے کا تجربہ یا تاثر ہو اس کو یہ ایک لڑی میں پرو کر جس منظم طریقے سے نثر میں منتقل کرتی ہیں اس کی داد نہیں دی جاسکتی"۔

شاعرانہ افسانہ نگار جناب فیصل فارانی ایک الگ انداز سے روبینہ فیصل کی تحریر پر تنقید کرنے والوں سے مخاطب ہیں ان کے مخاطب اردو ادب کے نقاد ہیں:

"زبان و بیان کے حوالے سے نقاد روبینہ فیصل کے افسانوں کے اسلوب پر یقیناً اعتراض کا حق رکھتے ہیں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ وہ کونسا شاعر یا ادیب ہے کہ جس نے زبان کے حوالے سے آزادی نہ لی ہو...... یا کوئی غلطی نہ کی ہو"۔

احمد رضوان روبینہ فیصل کے قریب کینیڈا میں ہی مقیم ہیں۔ وہ روبینہ کے افسانوں کے محبوب موضوع "عورت" کے حوالے سے بات کرتے ہوئے روبینہ کو یوں "ڈھال" فراہم کرتے ہیں:

"روبینہ کے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔ بقول منٹو برصغیر کے مرد پر عورت سوار نہیں ہوگی تو اور کون ہوگی۔ مگر نسائی ادب لکھنے والیوں نے بھی جم کر ان متنازع فیہ موضوعات پر قلم افشانی کی ہے۔ عورتوں سے جڑے مسائل کی بات، مردوں کے معاشرے میں ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیسے وہ اس دوغلی، دورخی اور مطلبی دنیا میں زیست کرتی ہیں ان افسانوں میں ایسی بہت سی بکھری ہوئی عورتیں اور کردار نظر آتے ہیں"۔

پروفیسر قیصر رضا صاحب چونکہ پروفیسر ہیں تو وہ ہر چیز کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کرتے ہیں اور خود کینیڈا میں ہجرتی زندگی گزار رہے ہیں لہٰذا وہ روبینہ کے افسانوں میں زندگی کے اس عنصر کے اثرات کے بارے میں فرماتے ہیں:

"روبینہ کی افسانہ نگاری ایک منفرد اور نمایاں خصوصیات یہ بھی ہے کہ وہ ہجرتی زندگی (Immigrant life) کے امور کو نہایت خوبصورتی اور مہارت سے سامنے لائی ہیں۔ بالخصوص دور حاضر میں تو عالمی سطح پر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کی بڑھتی ہوئی شرح ہجرت کی وجہ سے ہجرتی زندگی کے امور جدید معاشرتی زندگی کا اہم عنصر بن گئے ہیں۔ روبینہ نے تارکین وطن اور مہاجرین کی زندگیوں کی نفسیاتی، معاشرتی، معاشی پہلوؤں اور اس سے ملحقہ تبدیلیوں، کرب، امیدوں، مایوسیوں کو محکم انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ خود ہجرت کے عمل سے گزرنے سے وہ اس کی تمام پہلوؤں سے عموماً واقف ہیں"۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

عمران مفتی

حسن عباسی/لاہور

عمران مفتی مرگیا ہے۔

اُسے مر جانا چاہیے تھا۔ زندگی اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ نہ تو وہ کچھ کھا سکتا تھا۔ اب تو پانی بھی اس کے حلق سے نہیں اُترتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پیاس جم گئی تھی۔ جسم کیا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

یہی عمران مفتی دو سال قبل جب میرے دفتر آیا تھا تو جوانِ رعنا تھا۔ دراز قد، صحت مند، گورا رنگ اور مردانہ وجاہت سے بھرپور۔

اُس کی گفتگو میں وہی خود اعتمادی تھی جو عموماً صاحب ثروت لوگوں کی گفتگو میں ہوا کرتی ہے۔ عمران مفتی دولت مند ہونے کے باوجود عاجزی اور انکساری کا مرقع تھا۔ با اخلاق اور نرم مزاج ہونے کے سبب وہ حلقۂ یاراں میں پسندیدہ تھا۔ مفتی تھا، عالم فاضل اور صاحب علم تھا۔ عمران مفتی کی صحبت سے دوستوں کو سیکھنے کا موقع ملتا۔

وہ میرے پاس اپنے نعتیہ مجموعے ''ہو نگاہِ کرم'' کا مسودہ لایا تھا۔ اُس کی خواہش تھی اسے جلد از جلد چھاپ دیا جائے۔ کتاب کی اشاعت کے دوران عمران مفتی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُس کے اندر میں نے ایک دُرویش صفت شخص اور درد دل رکھنے والا انسان پایا۔ وہ اچھا شاعر تھا۔ لفظوں کے چناؤ برتاؤ کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا۔ عربی اور فارسی زبان جاننے کے سبب اُسے لفظوں کے ماخذ کا علم تھا اس لیے وہ فیس بک پر شعراء کے کلام کی اصلاح کا خاص شغف رکھتا تھا۔ مگر اس طرح کہ شاعر کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ وہ Inbox میں جا کر تفصیل کے ساتھ شاعر کو وضاحت کے ساتھ درست الفاظ اور ان کے صحیح استعمال کے بارے میں بغیر کسی منفعت کے بتایا کرتا تھا۔ مجھ سے بھی اس سے متعلق اُس کی گفتگو رہا کرتی تھی۔

عمران مفتی اپنی شاعری کے ذریعے دنیا بھر کے شاعروں کو چونکانا نہیں چاہتا تھا نہ ہی وہ ادبی دنیا فتح کرنے میانوالی سے لاہور آیا تھا۔ وہ صرف میانوالی کے شعراء کے مقابل اپنی شاعری کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا اُس کی ذات میانوالی سے شروع ہو کر میانوالی تک ختم ہو جاتی تھیں۔ میانوالی سے تعلق رکھنے والے اُردو کے منفرد و ممتاز شاعر منصور آفاق عمران مفتی کے ہیرو تھے۔ اگرچہ اس بات کا اظہار عمران مفتی نے کبھی نہیں کیا تھا مگر اس کی گفتگو میں اکثر منصور کا ذکر ہوتا تھا۔ خاص کر جب شاعری کا معاملہ ہوتا وہ منصور آفاق سے متاثر نظر آتا اور دوسری طرف اُس کے مقابل خود کو منوانا بھی چاہتا تھا۔ منصور آفاق نے جب فیس بک پر سہ غزلہ لگانے کا سلسلہ شروع کیا تو عمران مفتی نے اس سلسلے کو خود کے لیے نجانے کیوں چیلنج سمجھ لیا اور لگا تار ایک ہی ردیف میں قافیہ بدل کر سہ غزلہ کہے ان دنوں میں اس کی غزلوں کا پہلا سامع میں ہوا کرتا۔ وہ مجھ سے مکمل فراغ دلی کے ساتھ مشورہ کرتا تھا۔ یہ عمران مفتی کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ میانوالی کے شعرا جب اس کی غزلوں پر داد دیتے تو اسے بہت خوشی ہوتی اور جب منصور آفاق اور افضل عاجز نے بھی عمران مفتی کو داد دینا شروع کی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ ان دنوں اس نے بہت سا وقت اپنی شاعری کو دیا۔

''ہو نگاہِ کرم'' کی اشاعت کے بعد میں نے اس نعتیہ مجموعے کی تقریب پذیرائی ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں کرائی جس میں نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس طرح عمران مفتی نے لاہور کے ادیبوں کی توجہ حاصل کی۔ میں نے اپنی ادبی تنظیم ''پہچان انٹرنیشنل'' کے چند مشاعروں میں عمران مفتی کو بطور مہمانِ اعزاز مدعو کیا۔ عمران مفتی مجھے اپنی بہت سی خوبیوں کے باعث پسند تھا جن میں سب سے بڑھ کے عاجزی اور انکساری تھی۔ عمران مفتی نے ایک روز مجھے یہ راز بتا کر افسردہ کر دیا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور کچھ عرصہ سے اس کا علاج چل رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے تو اسے پندرہ دن سے زیادہ نہ جی سکنے کا کہہ دیا تھا۔ اس شام وہ اپنی رپورٹس گاڑی کے ساتھ والی نشست پر رکھ کے جب گھر کے لیے روانہ ہوا تو اسے زمین آسمان گھومتے نظر آئے اور اس کی گاڑی لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ پولیس والوں نے اسے نشہ کی حالت میں سمجھا۔ گاڑی کی تلاشی پر جب کینسر کی رپورٹس اُن کے سامنے آئی تو عمران مفتی کو گھر تک لے آئے۔ عمران نے وہ رات شدید کرب میں گزاری اور صبح وہ مکمل بہادری اور ہمت سے گھر سے نکلا۔ اس نے کینسر کے مرض سے مقابلہ کرنے اور اسے شکست دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے پاکستان اور بیرونِ ملک کے ڈاکٹرز سے علاج شروع کیا اور اپنے علاج پر لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں خرچ کر ڈالے۔ عمران مفتی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے خواب تھے جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ محبت، شادی، بچے، شعری مجموعوں کی اشاعت مگر کینسر کے مرض نے اسے کسی خواب کی تعبیر حاصل کرنے کی مہلت نہ دی۔ وفات سے تین روز قبل عمران مفتی نے کہا حسن صاحب! کوئی ایسی صورت ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں اور میں نے اسے

بہت تسلی دی کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر اسی طرح تم مشاعروں میں شرکت کرو گے۔ ادھورے شعری مجموعوں کی اشاعت ہوگی مگر اُس کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ وہ خود کو آئینے میں دیکھ کے ڈر جاتا۔ موت کا خوف اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اس لیے اُس نے شاعروں سے دوستوں سے رشتہ داروں سے سب سے ملنا ترک کر دیا تھا وہ ایک سال تک گوشۂ گمنامی میں رہا۔ اپنا موبائل نمبر بدل لیا تا کہ کوئی رابطہ نہ کر سکے۔ وہ پہلے کی طرح ہیرو بن کر سب کے سامنے آنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو مٹی کی چادر اوڑھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی وفات کی خبر میانوالی کے شاعروں اور دوستوں کے لیے بھی حیران کن تھی۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر کو اس کے کینسر کا علم نہ تھا۔ فیس بک سے پتہ چلا کہ اس کے جنازے میں اس کے دوست شعرا بھی شریک نہ ہو سکے۔ اس بات نے عمران مفتی کی روح کو بہت تکلیف پہنچائی ہوگی۔ کیونکہ وہ میانوالی کو فتح کرنا چاہتا تھا جس میں وہ ناکام ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس مرحوم دوست کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

نمونہ کلام عمران مفتی:

بات کوئی ان کہی رہنے بھی دو
گفتگو میں تشنگی رہنے بھی دو
آدمیت، احترامِ آدمی
احترامِ آدمی رہنے بھی دو
بے خودی، سرمستی و بیگانگی
عشق میں دیوانگی رہنے بھی دو
کوچۂ اُلفت میں جانا ہے تو پھر
جاں ہتھیلی پر دھری رہنے بھی دو
زندگی، آمد، برائے، بندگی
بندگی در زندگی رہنے بھی دو
ہر کسی سے دوستی اچھی نہیں
اجنبی کو اجنبی رہنے بھی دو
اک کرن، اُمید کی، عمرانؔ تم
اپنی آنکھوں میں بسی رہنے بھی دو

حسن پردے میں چھپا رہنے بھی دو
میرے دل کو، باخدا رہنے بھی دو
امتحاں، مت لو، دلِ درویش کا
پارسا کو نارسا رہنے بھی دو
انتہا، چاہت کی ہو سکتی نہیں
ابتدا کو ابتدا رہنے بھی دو
''گر تو می خواہی مسلماں زیستن''
ربط قرآں سے بنا رہنے بھی دو
مسجدیں، جتنی بنا لو چاہے تم
شہر میں اک میکدہ رہنے بھی دو
ہے یہی حسرت دلِ عمرانؔ کی
اس کو قدموں میں پڑا رہنے بھی دو
ہو اثر عمران اس میں یا نہ ہو

اپنے ہونٹوں پر دعا رہنے بھی دو
پھول، خوشبو تتلیاں رہنے بھی دو
گلستاں کو گلستاں رہنے بھی دو
اشک آنکھوں میں نہاں رہنے بھی دو
میرے دل کو جانِ جاں رہنے بھی دو
مجھ کو شہرت کی کوئی خواہش نہیں
بے نشاں ہوں بے نشاں رہنے بھی دو
ہوں مبارک تم کو یہ سرداریاں
میری پلے داریاں رہنے بھی دو
کچھ نہیں دکھتا بہت نزدیک سے
فاصلہ تم درمیاں رہنے بھی دو
کھینچ لو تم میرے پاؤں کی زمیں
سر پہ لیکن آسماں رہنے بھی دو
تم سے جو عمرانؔ جلتا ہے جلے
بدگماں کو بدگماں رہنے بھی دو

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

''ہم زمانے میں خدا جانے کہاں موجود ہیں''

حسیب اعجاز عاشر

تصوف کے حوالے سے رویم کہتے ہیں کہ تصوف کا مطلب نفس کو اللہ کی مرضی پر چھوڑ دینا ہے، شبلیؒ نے کہا کہ صوفی وہ ہوتا ہے جو دونوں جہاں میں بجز اللہ عزوجل کے اور کسی کو نہ دیکھے۔ ذوالنون مصری نے لکھا کہ صوفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو اپنا لیا۔ تصوف کو کسی دانشور نے نوافلاطونیت سے ماخوذ بتایا تو کسی فلاسفر نے بدھ مت سے اور کسی اہل علم نے تصوف کو یونانی فلسفہ کی بنیاد قرار دیا تو کسی مفکر نے اسے رہبانیت کا پیش خیمہ بتایا اور کسی نے اسلام کو اس کا سرچشمہ قرار دیا، اپنی اپنی سوچ وفکر کے مطابق تصوف کی تعریف کی جاتی رہی ہیں۔ بلاشبہ تصوف کے حوالے سے اس درجہ سوچ وفکر اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ شعروادب میں تصوف کو کبھی بھی نظرانداز نہیں کیا گیا خصوصاً اُردو شاعری کے تو حسن وعشق اور تصوف ہی دو اہم موضوعات رہے ہیں کچھ شعراء نے تصوف کو فقط برائے شعرگفتن خوب است کے طور پر برتا اور اہل ذوق کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کچھ شعراء کرام ایسے بھی ہیں جنہوں نے حسن وعشق اور تصوف پر کیا خوب طبع آزمائی کی کہ قاری فی البدیع ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' پکار اُٹھا۔

عصر حاضر میں آصف نظیر کا شمار بھی انہیں صفِ اول کے شعراء کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے ان کو موضوعِ سخن بنایا اور حق ادا کر دیا۔ آصف نظیر نے یوں تو ہر موضوع پر بڑی مہارت سے قلم اٹھایا مگر تصوف کو جس کمال فنی ہنرمندی اور تخلیقی احساس سے مزین کر کے شاعری میں ڈھالا ہے سبھی ان کے معترف ہیں اور یوں وہ ہر حلقہ شعر وادب میں ہر سطح پر خوب پذیرائی کے حقدار بھی بنے ہیں۔ آصف نظیر کے صوفیانہ کلام کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکار ہونے لگتی ہے کہ یہ اپنی ساری جدوجہد کائنات اور حیات کے اسرار سربستہ کو سمجھنے میں صرف کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ شاید میرؔ نے ان جیسے تخلیق کاروں کیلئے ہی لکھا ہے کہ تصوف کی گہری چھاپ کی وجہ سے لوگ ہر ذرے میں حسن مطلق کی تلاش کرتے ہیں۔ آصف نظیر کا تازہ مجموعہ کلام ''لاموجود'' منظر عام پر آتے ہیں حلقہ شعروادب میں مقبولیت سمیٹنے لگا ہے۔ اس کتاب میں شامل دیگر موضوعات کی طرح صوفیانہ کلام بھی قاری کو اپنے حصار میں لئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی اپنے مضمون بعنوان ''جہانِ لا موجود'' میں لکھتے ہیں کہ آصف نظیر کے مجموعۂ کلام ''لا موجود'' کی شاعری مختلف رنگ اور جداگانہ ذائقے کی شاعری ہے۔ حُسنِ الفاظ کے پیرہن میں شدتِ احساس جلوہ گر ہے۔ ایقان وعرفان کی تہ داری اور سرشاری سے تشکیل پانے والی یہ شاعری راحتِ قلب ونظر کا سامان بھی ہے اور تسکین شعور وفکر کا سرمایہ بھی۔ شاعر کی وجدانی کیفیات میں وفور بھی ہے اور مستی ورعنائی بھی۔ وہ دل کی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ یہ مجموعۂ کلام دشتِ حیات وکائنات میں شاعر کی جریدہ روی کی سرگذشت ہے اور اِس طلسمات تنہائی میں بہت سے عجائب و غرائب جھلک دکھاتے ہیں۔ ماورائی علوم وفنون سے شغف اور اِن میں ممارست کے شواہد اِس شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں اور کیفِ سخن میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ صاحب مطالعہ شاعر اگر خوش قسمتی سے اپنا حاصلِ مطالعہ تخلیقی ہنرمندی سے جزوِ شعر بنانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ شاعری ایسی ہی مختلف ہوتی ہے جیسی اِس مجموعے کی شاعری۔

کبھی گو نہ مکتب میں آئے گئے تھے
عجب علم ہم کو سکھائے گئے تھے
ہماری طرح تھیں تمہاری شبیہیں
مگر تم سے ہٹ کر بنائے گئے تھے
ہمارا قبیلہ تھا سب سے مقدم
ہمی قتل گاہوں میں لائے گئے تھے
سب اسماء ہمارے ہی تھے اسم اعظم
جو مشکل میں سب کو پڑھائے گئے تھے
ہمارے تعرّف کو درجہ بہ درجہ
الف لام اور میم لائے گئے تھے

اِس مجموعے میں فارسی کے عظیم صوفی شاعر خواجہ فریدالدین عطار نیشا پوری کے ایک معرکہ آرا قصیدے کی بہت کامیاب منظوم ترجمانی کی گئی ہے جسے تخلیقِ مکرر کہنا چاہیے، یہ ترجمانی بجائے خود خاصے کی چیز ہے۔ آصف نظیر کو اِس مجموعے کی اشاعت

مبارک ہو۔ یقیناً یہ سفینۂ سخن شایانِ شان داد و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا کیوں کہ اس میں سراہے جانے کے قابل بہت کچھ ہے۔

آصف نظیر کے کمال فن پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ''فنِ شعر سے کامل آگاہی'' کے عنوان سے افتخار عارف اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ

لاموجود آصف نظیر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کی غزلوں کی پہلی کتاب ''موج میں دریا'' کے عنوان سے اربابِ سخن شناس سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے لیکن زیرِ نظر مجموعہ اپنی نوعیت میں ایسا مجموعہ ہے کہ اسے پڑھ کر ایک حیرت انگیز خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ غزلوں پر مشتمل اس مجموعے میں تہذیبی فضا اور منفرد لب و لہجے میں بیان کردہ کلاسیکی روایت کا تسلسل اس مجموعے کو بڑی تعداد میں چھپنے والے دوسرے شعری مجموعوں سے ممتاز کرتا ہے۔

تخلیقاتِ آصف پر علامہ بشیر رزمی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون بعنوان ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' میں لکھتے ہیں کہ آصف نظیر شعری مثلث تخیل، عروض اور موسیقی سے نہ صرف آشنا ہے بلکہ وہ عملی طور پر بھی اس کا اظہار کرتا ہے اس حقیقت کے لیے اس کی پہلی کتاب ''موج میں دریا'' اور زیرِ نظر تازہ مجموعۂ غزلیات "لاموجود" کا مطالعہ کافی ہے آصف نظیر پہلے ''موج میں دریا'' میں غزل کی گل پوش وادیوں میں محوِ گل گشت رہا اور پھر تصوف کی پُر اسرار وادیوں میں داخل ہوا تو لاموجود میں اپنے شباب تک پہنچا۔ زیرِ نظر کتاب لاموجود محض تصوف کے مضامین پر مبنی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے ہر صفحہ پر ملکۂ ناکتخدا غزل جدید مضامین کے تنوع اور آصف نظیر کے منفرد لب و لہجے کے ساتھ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے کیونکہ غزل کا دامن بہت وسیع ہے اور شائد موضوعات کا یہ تنوع کسی اور صنفِ سخن کو نصیب نہیں آپ اس میں انسانی جذبات اور احساسات کے صد رنگ پہلو بیان کر سکتے ہیں یہاں تک کہ جدید اور قدیم کی حدیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس بات میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ بلاشبہ آصف نظیر کی یہ تازہ تخلیق وقت کے ساتھ ساتھ مقبولیت کے اُس قابل رشک مقام پر پہنچے گی جس کی یہ مستحق ہے۔ تصوف کے تجسس میں سرگرداں قارئین اس کتاب کے مطالعے سے اپنی پیاس خوب بُجھا سکتے ہیں، غزلوں پر مشتمل کتاب ''لاموجود'' کی تعارفی قیمت 400 روپے ہیں جسے نستعلیق پبلی کیشن سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
چاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

ڈاکٹر جواز جعفری/لاہور

میرے پہاڑ
میری حفاظت سے قاصر ہیں

اے ڈھلتی شام
وہ چہرہ کہاں ہے
میں جسے دیکھنے کا تمنائی ہوں؟
وہ بالکونی
اس کی عدم موجودگی کا دکھ سہتی ہے
میں اس گھر کے ادھ جلے دروازے کو دیکھ کر
الوداعی ہاتھ ہلاتا ہوں
صنعا کی گلیوں میں پرندوں کی جگہ گولیاں اُڑتی ہیں

وہ کندھوں پر میزائل رکھے
شہر کے مرکزی دروازے تک آپہنچے ہیں
تاکہ میرا چہرہ
دجلہ میں بہادیں
اور میں باقی ماندہ زندگی
اپنی شناخت کی تلاش میں بسر کروں
میں نے انہیں نبولیوں سے لدے نیم کے پیڑ کے قریب
قدم آرائی کرتے دیکھا
ان کے دائیں پاؤں کے نیچے میرے زیتون کے باغات
اور بائیں پاؤں تلے
میرے پانچوں دریا تھے

دھوپ
میرے شہتوت کے سبزہزاروں کو چاٹ رہی ہے
وہ ہونٹ
انگور کی طرح رسیلے ہیں
اور خدا
برگد کے پیڑ سے ٹیک لگائے
دھوپ سے مکالمہ کرتا ہے!
وہ دن بھی تھے
جب میں میرانشاہ کے نواح میں
اپنے کھیتوں میں روشنی کاشت کرتا تھا
اب یہاں تاریکی کی فصل اُگتی ہے!

وہ ہمارے صحنوں میں
نفاق بونے آئے ہیں
تاکہ ہم منتشر ہو جائیں
میرے پہاڑ
میری حفاظت سے قاصر ہیں
وہ خود خطرے کی زد پر ہیں

میرے پاس خوابوں کے سوا کچھ نہیں

میرے پاس خوابوں کے سوا کچھ نہیں
اور وہ چاہتے ہیں
میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہو جاؤں
انہیں جنگ کے میدانوں میں خود کفالت میسر نہیں
وہ میرے شہروں میں جنگ آزمائی کرنے آئے ہیں
ان کے سینوں کے وسط میں آگ کا دریا بہتا ہے
میری زمین کا دامن جل رہا ہے
میں جن کے تکلم میں جی اُٹھتا ہوں
میری منزل
گم ہو گئی
میرا راستہ مسمار کر دیا گیا
میری ڈل جھیل
خون تھوکتی ہے
مسافت
میرے تلووں میں پڑی سو رہی ہے!

میرے سامنے موت
اور تعاقب میں دشمن ہے
میں
سمندر میں راستہ بناتا ہوں
غزہ سے سری نگر تک پھیلے میرے جوان
مجسمے تراشنے کی عمر میں
پتھروں سے جنگی گاڑیوں کو نشانہ بناتے ہیں
وہ نئے عہد کی جنگ
قدیم ہتھیاروں سے لڑ رہے ہیں!

نامور شاعر ڈاکٹر جواز جعفری کی نظموں پر مشتمل مجموعہ

متبادل دنیا کا خواب

(جنگ مخالف نظمیں)

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: فکشن ہاؤس، مزنگ والا چوک

ڈوبنے والوں کے اس درد کا چارہ کب ہے
بات مشہور ہے، تنکے کا سہارا کب ہے
بس یہی سوچ کے پردیس سے لوٹا نہیں میں
میری بستی میں بھی اب میرا گزارا کب ہے
عمر بھر چبھتے رہے آنکھ میں ریزے جس کے
خواب وہ ٹوٹا ہوا خواب ہمارا کب ہے
جب بھی تھک جائیں مسافر دو گھڑی دم لے لیں
ایسا ان سرمئی سڑکوں کو گوارا کب ہے
وہ بھی کرتا ہے بہانے سے مرا ذکر اکثر
طوقِ نسبت کا، یہ اس نے بھی، اُتارا کب ہے
اور کیا سوچ سمندر میں وہ اُترے ہوں گے
جان جاتی ہے تو جائے، یہ خسارہ کب ہے
لوٹ پانا نہیں ممکن کسی گزرے پل میں
وقت کی راہ پہ گزرے جو دوبارہ کب ہے

عہد وفا اور پیار کی باتیں
چھوڑ ناں یہ بیکار کی باتیں
زرد رُتوں میں لازم ٹھہریں
گل کے قصے خار کی باتیں
اب کے برس تو ماہِ رمضان
عید ملن، افطار کی باتیں
ہم نے صحافت کر کے دیکھی
جھوٹی ہیں اخبار کی باتیں
گونگا قیدی سوچ رہا ہے
آزادی، اظہار کی باتیں

ڈال رہی ہیں بل ماتھے پر
تیرے سخن، افکار کی باتیں
چھاتی پھلا کر کرتے ہیں سب
حاکم کی دربار کی باتیں

سچی بات بتاؤں کیا؟
سب کو آج رُلاؤں کیا؟
میں گھر بیچ کے آیا ہوں
واپس لوٹ کے جاؤں کیا؟
مجھ پر روز جو ہنستے ہیں
ان کو اور ہنساؤں کیا؟
ہر اک سنگ خدا ہے اب
ہر جا سر کو جھکاؤں کیا؟
چادر گر یہ پرانی ہے
پھیلے ہیں زیادہ پاؤں کیا؟
ہے پوشاک بدن پر جو
اس کو بیچ کے کھاؤں کیا؟
پاپی پیٹ لگا ہے ساتھ
گنگا روز نہاؤں کیا؟
کیا کچھ کام ضروری ہے؟
خود کو ڈھونڈ کے لاؤں کیا؟
خود سے کر کے بہانہ میں
میٹھی نیند سو جاؤں کیا؟
گرچہ مونہہ پہ تالا ہے
پھر بھی گیت سناؤں کیا؟
کاہے بھینس ہلائے سر
اچھی بین بجاؤں کیا؟

اپنا ہاتھ قلم کر کے
دن کو رات دکھاؤں کیا؟
سینے سانس اٹکتی ہے؟
جنگل ایک اُگاؤں کیا؟

کافر ہیں سارے لوگ یا منہ میں زباں نہیں
اس شہر میں کسی کو بھی حکمِ اذاں نہیں
اک اور طرح کا سانحہ درپیش ہوتا تھا
گر حادثہ یہ آنکھ پہ ہوتا عیاں نہیں
میرا بدن مہک رہا ہے زخم ہیں ہرے
ان سُرخ سُرخ پھولوں کی حاجت میاں نہیں
لیکن مگر کو چھوڑ کے قاتل کا نام لے
اتنا بھی چارہ گر کو گوارا یہاں نہیں
مسند نشین کہتا ہے بیٹھو خاموش سب
ہے کون سا مگر وہ یہ ہوتا کہاں نہیں

بے خبر خود کو پایا مرے ہوش اُڑ گئے
میں ہوش میں جب آیا مرے ہوش اُڑ گئے
ایمان تھا خزاں ہی مقدر چمن کا ہے
کوئل نے گیت گایا مرے ہوش اُڑ گئے
پھینکا تھا آسمان پہ جو اپنے ہاتھ سے
پتھر وہ سر کو آیا مرے ہوش اُڑ گئے
کل رات جب مجھے مرے اک سوگوار نے
کچھ اپنا غم سنایا مرے ہوش اُڑ گئے
لے کر گیا تھا آئینہ میں رعب داب سے
اس نے مجھے دکھایا مرے ہوش اُڑ گئے

وہ آدمی جو خدا کے قریب ہوتا ہے
قسم خدا کی بڑا خوش نصیب ہوتا ہے
ہمیشہ رہتی ہے آنکھوں میں یار کی صورت
فراقِ یار کا عالم عجیب ہوتا ہے
گوارا کرتے ہیں وہ تلخیاں زمانے کی
دلوں میں جن کے خیالِ حبیب ہوتا ہے
بڑا بلند ہے اس کا مقام عالم میں
نصیب جس کو مقامِ صلیب ہوتا ہے
جسے ملی ہے محبت کسی سے بچپن میں
وہ دل فگار مزاجاً ادیب ہوتا ہے
یہ معاملہ ہے عجب عشق کے مریضوں کا
کہ اُن کا دشمنِ جاں ہی طبیب ہوتا ہے
وحید کر نہ گلہ غیر سے رقابت کا
ہمیشہ دوست ہی تیرا رقیب ہوتا ہے

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے
اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے
اُس کو ملتے نہیں کبھی کانٹے
نیکیوں کے جو پھول بوتا ہے
شعر اُس وقت لب پہ آتے ہیں
دل میں جب دردِ یار ہوتا ہے
کیوں مرا رُخ نہ تر ہو اشکوں سے
پھول شبنم سے منہ کو دھوتا ہے
میں سکھاتا ہوں جس کو تیر اکی
وہی انساں مجھے ڈبوتا ہے

جس کے دل میں غمِ جہان ہو
کب وہ عاشق وحید ہوتا ہے

دیکھ کر آپ کو اپنا نہ رہا آج کے بعد
لوگ پوچھیں گے مرا تجھ سے پتہ آج کے بعد
آج اک آئی نظر حور پری ایسی مجھے
اب نہ مانگوں گا میں حوروں کی دعا آج کے بعد
جان لو اُس میں تمہارا ہی حوالہ ہوگا
شعر جو میں نے کبھی کوئی کہا آج کے بعد
مار ڈالے گا مجھے تیرا بچھڑنا ہے یقین
یار ہونا نہ کبھی مجھ سے جدا آج کے بعد
کچھ بھی ہو سوچ لیا ہے مری ہمدم مری جاں
تجھ کو ہی چاہیں گے ہم حد سے سوا آج کے بعد
میں جدھر دیکھوں نظر آتی ہے تو ہی مجھ کو
ہوگی اب تو ہی خیالوں میں سدا آج کے بعد
ہم نے خود سے بھی یہی عہد کیا ہے جاناں
لیں گے دیدار کا تیرے ہی مزا آج کے بعد
دلِ آشفتہ نوا کی ہے صدا یہ قندیل
اُسے تقدیر مری کر دے خدا آج کے بعد

وہ مجھے ہر کہیں نظر آیا
اور سب سے حسیں نظر آیا
آسماں کا بھی حُسن تجھ سے ہے
تو ہی حُسنِ زمیں نظر آیا
پاس تھا تو بعید تھا کتنا
دور جا کے قریں نظر آیا
اور بھی لوگ ہوں گے محفل میں
بن ترے کچھ نہیں نظر آیا
میرے اس دل کے چار خانوں میں
ایک تُو ہی مکیں نظر آیا
آسمانوں میں بھی وہی قندیل
وہی زیرِ زمیں نظر آیا

مانا کہ اُس کا حُسن بلا کا غضب کا ہے
لیکن یہ مسئلہ ہے وہ محبوب سب کا ہے
میں چاہتا ہوں ایک زمانے سے آپ کو
کیسے کہوں میں اُن سے تقاضا ادب کا ہے
کچھ اس کو اپنی رنگ و اداؤں پہ ناز ہے
کچھ نخوت و گھمنڈ اُسے نام و نسب کا ہے
اے کاش ایک بار کوئی یہ نوید دے
وہ منتظر تمہارے لیے رہ میں کب کا ہے
اس کافرا کے عشق میں جاں سے گئی گئے
ہوش و حواس میں ہوں یہ احسان رب کا ہے
چہرے پہ اُس کے صبحِ منور کا نور ہے
گیسو میں اُس کے سایہ کسی گہری شب کا ہے
پہلے کبھی وہ آئے جو آج آئیں گے وحید
یہ شوق و انتظار تیرا بے سبب کا ہے

شازیہ رباب/کبیر والا

یہاں سے لوٹ چلو

کچھ لفظ کھو گئے شاید
کچھ معنی بدلے بدلے ہیں
کچھ لوگ نہیں وہ اپنے سے
جو من کے سچے ہوتے تھے
جو درد کو درد سمجھتے تھے
جو دل کی لگن سے واقف تھے
جو ہجر چبھن بھی جانتے تھے
جو تال سے تال ملاتے تھے
جو حال سے حال ملاتے تھے
اب وقت عزیزو آیا ہے
جب روح کی چادر چھلنی ہے
جب دھرتی ماں بھی روتی ہے
جب محبت توبہ کرتی ہے
اور خون کے آنسو روتی ہے
جب لفظ سچائی کو ترسیں
جب لب شنوائی کو ترسیں
صحرا کی مانند حال اپنا
یہاں ابر رسائی کو ترسیں
تم لوٹ چلو، ہاں لوٹ چلو
اس دیس کی بازی پلٹی ہے
یہاں گونگے بہرے رہتے ہیں
یہاں لفظ بے معنی لگتے ہیں
ہجر کی دیمک لگ جائے تو
اس روگ کا ہے علاج کہاں
اچھا ہے یہاں سے لوٹ چلو

تم بن

رگ رگ میں اُترتی ہوئی تیری یادیں
بے خودی کی آہستہ روی جاری ہے
تو جیتے یا میں ہاروں کوئی غم ہی نہیں
عقل و دل کے مابین یہ جنگ جاری ہے
ابھی سوچا نہیں کیا ہوگا انجام میرا
ابھی سرد ہوتے ہوئے ہاتھوں کو ذرا تھامو
روح پھونک دو ذرا سی میرے جیون میں
کہ ان لوگوں کی پکار نہیں بننا مجھ کو
جو مر جاتے ہیں جینے سے ذرا پہلے
زندگی اس نے جو دی ہے آؤ جیتے ہیں
تیری آنکھوں سے ہی ہم مے پیتے ہیں
سرور لائے رگوں میں وہ جام لاؤ ذرا
تم اپنی آنکھوں کا پیمانہ ادھر لاؤ ذرا
کوئی اور ہو ساقی یہ گوارا نہیں
آؤ جیتے ہیں تم بن مگر گزارا نہیں

محبت پاگل ہوتی ہے

محبت پاگل ہوتی ہے
اک بت پہ جان چھڑکتی ہے
اور اس کی ہو کر رہتی ہے
مٹی کے بند پنجرے میں
سانسوں کا آنا جانا ہے
دور کہیں آفاق پہ بھی
سانسوں کی گنتی جاری ہے
زندگی تو سونپے جاتی ہے
ہر لمحہ موت کو سانسیں اور
یہ محبت ہے اس رمز سے جو
ہر دم بیگانہ لگتی ہے
محبت پاگل ہوتی ہے
اک درد وابستہ اس سے ہے
اک جنوں سا اس کو بھاتا ہے
اور دیوانگی جو روند کے سب
اس کی رگوں میں دوڑتی ہے
انساں کو آخری سانس تلک
ہزار عذاب سناتی ہے
پھر بھی من کو بھاتی ہے
الزام کئی عتاب کئی
یہ اپنے تن پہ سہتی ہے
محبت پاگل ہوتی ہے
اپنے بھی خفا سے رہتے ہیں
ہمدرد جدا سے رہتے ہیں
یہ روگ تو ایسا روگ پیا
صرف درد شناسا رہتے ہیں
اک مٹی کی فانی مورت سے
سانسوں کی ڈور بندھی ہو پھر
وہ مورت دید سے اوجھل ہو
تو سانسیں رُکنے لگتی ہیں
ایسی دیوانی ہوتی ہے
محبت پاگل ہوتی ہے
محبت دل میں بس جائے تو
کوئی سجدہ نہ کوئی تسبیح
اس روگ سے دیں شفا ہمدم
کوئی مسجد نہ کوئی مندر
اس دل کا ٹھکانہ بن پائے
کوئی تعویذ نہ دید کوئی
اس درد کا مرہم بن پائے
ہر سو یہ اس کو ڈھونڈے جو
سورت من میں بس جائے
محبوب کی صورت دیکھنی ہو
تو موت سے بھی لڑ جاتی ہے
محبت پاگل ہوتی ہے

عورت

حنیف سیّد/انڈیا

یوں تو پروفیسر بھانو؛ ایسے نہ تھے۔ اوّل تو عمر لز رچکی تھی، اُن کی، دوسرے پانچ بچّوں کے باپ بھی تھے وہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈگری کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے سماج میں ایک مقام تھا، اُن کا۔ اِس کے مدِ نظر ایک جوان بدھوا سے عشق زیب نہیں دیتا تھا، اُن کو، لیکن وہ بھی کرتے کیا....؟ جب رنجنا ہی پیچھے پڑگئی تھی، اُن کے۔

ہوا یوں کہ رنجنا جب اپنے بیٹے دیپو کے داخلے کے لیے کالج پہنچی اور پروفیسر بھانو کو دیکھتے ہی پہلے تو جھجکی وہ، پھر چہرہ تمتمایا، پسینا آیا، ہاتھ پیر پھول گئے، جسم تھرتھرا کر ٹھنڈا پڑ گیا، دِل بے قابو ہوا، بڑی مشکل سے سنبھالا خود کو، اور پھر جانے اَن جانے جذبوں میں ڈوب کر دیوانی سی ہوگئی وہ۔ ویسے وہ تھی نہیں ایسی، پر جب سودا سمائے، تو کیا کیا جائے....؟ بھانو نے بچنے کے لیے ہاتھ پیر تو بہت مارے، لیکن بچ نہ پائے، بے چارے۔

لوگوں کو حیرت تھی تو اس کی کہ جس رنجنا کو بھری جوانی میں جب کوئی ہوا نہ لگی تھی، جس کے ماتا پتا بچپن سے ہی بھگوان کو پیارے ہوگئے تھے، چاچی نے بہت دنوں تک چوکا باسن کے لالچ میں پکے پھل کو پال میں پڑا رہنے دیا، اور جب اُن کی دُکھتی رگ کو سماج نے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کیا، تو لوک لاج کے کارن دہرادون کے ایک کالج کے چپراسی راموسے دھروتا کرادیا، اُس کا۔ دھرونے کے بعد اُس کے شباب میں شراب کا سا نشہ کچھ کچھ گھلا ہی تھا کہ رامو دو ماہ بعد ایک پروفیسر کے ہاتھوں مارا گیا۔ رنجنا پاگل ہوگئی۔ چاچی کی بن آئی، وہ چوکا باسن کے لیے پھر لے آئی۔ آٹھ ماہ بعد دیپو پیدا ہوا۔

رنجنا ہندستانی عورت تھی، جس نے پتی کو پرمیشور مان کر اپنا جیون راموکی یاد میں، دیپو کے سہارے گزارنے کا عہد کیا تھا۔ دیپو بہت پیارا تھا، اُس کے لیے۔ خوب پڑھاتی لکھاتی تھی اُس کو۔ ہر وقت اپنے دیپو کے ساتھ رہتی تھی۔ اپنے پتی کی جینتی بڑی لگن سے مناتی تھی وہ۔ جینتی کے روز خوب بنتی سنورتی، دونوں ہاتھوں میں بھر بھر چوڑیاں، نئے نئے کپڑے پہنتی، ایک تو تھی ہی خوب صورت، اُس پر سولہ سنگار، سیندور، بندی، بس دُلھن بن جاتی وہ، پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی، کہیں کچھ کمی ہوتی تو دور کر کے اپنے راموکی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوتی، آنکھیں بند کر کے۔ پھر اُس کا چہرہ بگڑ جاتا، خوب روتی، ساری چوڑیاں توڑ دیتی، ہاتھ پٹک پٹک کر لہولہان ہو جاتا سارا جسم۔ خوب تڑپتی، کلپتی۔ بین کر کر کے اپنے راموکے لیے روتی۔ پڑوسی اُس کی بھری جوانی دیکھ کر شادی کی صلاح دیتے، لیکن وہ انکار کر دیتی، سختی سے۔ پڑوسی بھی زیادہ زور نہ دیتے، کیوں کہ اُس کی آنکھیں چار ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا کسی نے۔ تلسی کی پوجا کرتے کرتے بال سفید ہونے لگے تھے، اُس کے۔

اَب دیپو بھی بڑا ہوگیا تھا۔ اُس کے انٹرمیڈیٹ کر لینے کے بعد ہی تو وہ کالج گئی تھی، اُس کے ساتھ۔ بس اُسی وقت تو لوک لاج کو طاق میں رکھ کر بھانو سے تعلق ہوگیا تھا، اُس کا۔ بھانو بھی نئے نئے آئے تھے، کہیں باہر سے، نوکری چھوڑ کر، کسی رنجش کے باعث۔ رنجنا جب اُن پر مرتی تو پہلے پہل کترائے وہ۔ لیکن رنجنا جب اپنے عشق کا سیلاب لیے آگے بڑھی تو بھانو بھی بچ نہ پائے، بس ڈوب گئے بھنور میں، پوری طرح۔ آخر پتھر کب تک محفوظ رہتا، رسّی سے۔ ایک نہ ایک دن تو نشان پڑنا ہی تھا، پتھر پر۔ رسّی دھیرے دھیرے اپنا کام کرتی رہی اور نشان گہرا ہوتا گیا۔ بہ ہرحال رنجنا بھی بڑی حد تک بدنام ہوگئی، سماج میں۔ صرف چاچا چاچی اور محلّے والے ہی نہیں، دیپو بھی نفرت کرنے لگا، اُس سے۔ لیکن اپنے دلی معاملے کی مداخلت میں کسی سے بھی سمجھوتا منظور نہ تھا، اُس کو۔ اُس نے جوانی صرف ایک بار ملنے اور اُس کو بے باکی سے انجوائے کرنے کا منہ توڑ جواب دیا تھا، سماج کو۔ اُس کے خیال میں سماج ستار کا تار ہے، چھیڑو تو آواز گونجتی ہے، نہ چھیڑو تو کوئی آواز نہیں، یا پھر ایک اژدہا ہے سماج۔ شری کرشن کی طرح ناتھ لو، اُس کو، یعنی کہ پیر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ اُس پر، تو قابو میں، ورنہ تو زہر ہی زہر ہے زندگی۔ یعنی کہ موت۔

رنجنا، اَب بھانو کے ساتھ بازاروں اور سنیما گھروں میں اکثر دیکھی جاتی۔ کوئی کچھ بھی نہ کہتا، اُس کو۔ مگر دیپو احساس کرتا، وہ خوب کڑھتا، اندر ہی اندر۔ وہ بھی دیپو کی نظر سمجھ لیتی، دیپو سے کہیں زیادہ اُداس ہو جاتی، وہ۔ مگر ڈٹی، رہتی مستقل مزاجی سے۔ اُس نے اَب بھانو کو اپنے یہاں بلانا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ اُن کی تواضع میں کوئی کمی نہ رکھتی، لیکن یہ اُس کے عشق کی معراج تھی کہ اُس نے اَب تک بھانو کا ایک پیسا بھی نہ خرچ ہونے دیا تھا، خود پر۔

چاچا چاچی بھی ایک ایک کر کے پیارے ہو

گیے تھے، بھگوان کو۔مکان اور کاشت کی واحد وارث صرف وہی رہ گئی تھی۔اب تو خوب خوب ناز نخرے اُٹھائے جاتے تھے، بھانو کے۔ بھانو نے بھی پوری طرح نظر انداز کر دیا تھا سماج کو، اُس کے عشق میں۔ لیکن اُن کا ہاتھ اُس کے دامن تک نہ پہنچ سکا تھا، ابھی تک۔حالاں کہ کوشش بہت کی تھی، اُنھوں نے۔لیکن وہ تھی کہ ہاتھ نہ آ رہی تھی، اور دور بھی نہ جا پا رہی تھی ،اُن سے۔اِسی بات کو لے کر بھانو کئی بار روٹھ بھی چکے تھے ،اُس سے۔لیکن وہ تھی کہ بڑی خوبی کے ساتھ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں بہالائی تھی، اُن کو۔

دسہرے کی تعطیل نے اُن کے عشق میں اور چار چاند لگادیے ، بھانو میلا گھومنے کے بعد اُس کی ضد پر اُس کے گھر آجاتے ،پھر تو پہروں باتیں ہوتیں۔ دونوں نے اپنے اپنے کانٹوں میں لذیذ چارے پرو رکھے تھے۔لیکن نٹ کھٹ مچھلیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ نہ لگنے کی مانو قسم کھا رکھی تھی۔شاید کسی خاص وقت کے منتظر تھے، وہ دونوں۔

دیپو سب سمجھ رہا تھا، اُس کے غصّے کا باندھ پھٹنے ہی والا تھا۔کئی روز سے کھانا پینا تک چھوڑ دیا تھا، اُس نے۔لیکن رنجنا کا عشق بِنا پتوار کی کشتی کی طرح بہتا ہی چلا جا رہا تھا۔مگر بھانو نے چڑیا، پنجرے میں نہ آنے کی صورت میں پنجرا توڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔حالات سازگار دیکھ کر رنجنا نے ہتیار ڈال دیے تھے۔اور اگلے روز دیپو کو کسی کام میں اُلجھا کر اُن کے ساتھ رات گزارنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

رنجنا، بچپن ہی سے بڑی وقت شناس تھی۔ حالات نے اُس کو مزید پختہ اور سنجیدہ بنا دیا۔اِس کے باوجود دیپو کو بہلانا اور سمجھانا اُس کے بس کا نہ تھا۔کئی بار دیپو نے اُس سے نظر بگاڑ کر بات بھی کی ،لیکن اُس نے دودھ کے نیچے آنچ تیز کرنا مناسب نہ سمجھا۔اُدھر دیپو نے بھی اپنے پروفیسر بھانو سے کوئی تلخ بات نہ کی کیوں کہ وقت شناس ماں کا بیٹا ہونے کے ناتے اپنے مستقبل پر پوری نظر تھی ،اُس کی۔لیکن دودھ کب تک آنچ سہتا۔اُبھان تو آنا ہی تھا، ایک نہ ایک دن ایسی آنچ میں۔لیکن جب بھی اُبھان آتا، اُس میں۔وقت شناس ماں؛ کبھی آنچ کم کر دیتی تو کبھی پانی ڈال دیتی ،دودھ میں۔لیکن آج اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ دیپو کو سمجھائے بھی تو کس طرح۔سانپ کو مار لینے اور لاٹھی کو ثابت رکھنے کی قائل تھی وہ۔آخر اُس نے ترکیب نکال ہی لی، رات بھر کروٹیں بدل بدل کر۔

''چل اُٹھ۔'' صبح ہوتے ہی وہ دیپو پر برس پڑی۔ دیپو گھبرا کر اُٹھا اور ماں کو عجب انداز سے گھورنے لگا۔

''گھورتا کیا ہے، شرم نہیں آتی، تجھ کو....؟ سانڈ جیسا جسم، کمائی نہ دھائی کا۔ مجھ سے گھر نہیں چلتا اَب۔پڑھنا لکھنا چھوڑ...! اَب کمانے کی فکر کر، کمانے کی۔دانہ نہیں رہا گھر میں۔سارا زیور پڑا ہے گروی۔ سات ہزار کا نوٹس آیا ہے سُنار کے یہاں سے۔آج ہی ادا کرنا ہے۔ورنہ سارے زیورات ضبط۔''ماں نے طیش دکھایا۔

''کیا بکتی ہے ...؟ ماں..!'' دیپو؛ بن بادل برسات ماں کا غصہ دیکھ کر غرّایا اور وہ سہم گئی، دودھ کا اُبھان دیکھ کر۔

''بکتی ہوں....؟ مَیں نے تجھ سے ایک اکھر نہیں بولا، آج تک۔اَب پانی سر سے اُونچا ہوتا جا رہا ہے، مجھ کو اپنے گھر کے حالات سدھارنے کے لیے ہر حالت میں سات ہزار روپے چاہیے، آج شام تک۔'' ماں آخر ماں تھی، وقت شناس ماں، اُس نے دودھ کے لحاظ سے برتن بڑا رکھ دیا، آنچ پر۔دودھ میں اُبھان آیا، لیکن برتن کے حصار سے باہر نہ نکل سکا۔

''بیٹا....! مَیں جانتی ہوں کہ یہ سب سُن کر دہل گیا، تو۔اور یہ بھی جانتی ہوں کہ سات ہزار کا انتظام کرنا، وہ بھی شام تک، غیر ممکن ہے آج، پر نکال کوئی ترکیب۔'' دودھ جب جلنے لگا اندر ہی اندر تو وقت شناس ماں نے آنچ کم کر دی۔

''کیا ترکیب نکالوں....؟''

''کچھ بھی۔''

''کچھ بھی کیا....؟''

''کرنا تو پڑے گا ہی ، کچھ نہ کچھ۔ورنہ ضبط ہو جائیں گے، زیورات۔'' ماں نے گھر کے حالات کا سہرا بیٹے کے سر باندھ کر التجا کا دامن دراز کر دیا۔

''پر یہ تو بتا....! کروں کیا مَیں....؟''

''سات ہزار کا انتظام۔''

''میرے بس کا نہیں۔''

''ہے تیرے بس کا۔'' رنجنا نے دیپو کو اپنے حصار میں پوری طرح قید کر لیا تھا، اور اَب وہ اُس کو اپنی مرضی کے مطابق رُخ دینا چاہتی تھی۔

''وہ کیسے....؟'' دیپو نے دریافت کیا۔

''تو کر سکتا ہے انتظام سات ہزار کا۔''

''اَب بتا نا کہ کیسے انتظام ہو، سات ہزار کا؟'' ماں سے پھر سوال کیا، اُس نے۔

''پڑوسی کی جیپ لے جا، آنکھ بچا کر اور کان پورسے نوٹ پکّے کر لا۔'' رنجنا نے بڑی ہمت کر کے مُنہ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا....؟ ہوش میں تو ہو، ماں....؟'' دیپو طیش کھا کر کھڑا ہو گیا۔

''اِس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں ،اِس وقت۔'' رنجنا نے دیپو کا طیش دیکھ کر نرم لہجے میں حالات کی جھولی پھیلا دی۔

''یہ نہیں کر سکتا مَیں۔''

"کرنا تو ہوگا ہی۔" رنجنا کی آواز، دیپو کی آواز پر بھاری پڑ گئی۔

"کیا کرنا ہوگا اور کیا نہیں، یہ اچھی طرح جانتا ہوں مَیں۔" دیپو نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا، اور ایک کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

"دیپو....! ہوش میں تو ہے...؟ تو..!" وقت شناس ماں نے دبی آواز میں کواڑ تیزی سے ہلا ڈالے۔

"مجھ کو ہوش کے لیے چھوڑا ہی کہاں، تو نے...؟"

"تو سمجھا نہیں میری بات۔ کھول تو سہی، مَیں سب سمجھادوں گی تجھ کو۔" ماں نے حالات کے تحت اپنے سارے ہتیار ڈال دیے۔

"تم اَب اُس پروفیسر کو سمجھاؤ۔"

"ہاں ہاں وہی سمجھاؤں گی، سب کچھ تجھ کو۔ پہلے کھول تو، تو کواڑ...! وہ تیرے پتا کا قاتل ہے، مَیں بدلا لینا چاہتی ہوں، اُس سے، تیرے پتا کا، یہ ڈراما ہے سب، تو سمجھتا کیوں نہیں...؟" ماں پانی کی طرح اُبلتے دودھ پر برس پڑی۔ دودھ کا اُبھان فوراً بیٹھ گیا۔ دیپو نے کواڑ کھول دیے، ماں نے لپک کر گلے لگالیا، اُس کو۔ اور سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اُس کا سر سہلانے لگی۔

"پروفیسر؛ قاتل ہے، پتاجی کا...؟" دیپو نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے ماں سے دریافت کیا۔

"ہاں بیٹا، ہاں...! آج رات اُس کو قتل کرنا ہے ہر حالت میں، مَیں چاہتی ہوں کہ تو حوالات چلا جا، تا کہ کوئی الزام نہ آئے، تجھ پر۔"

"اَب تو مَیں ماروں گا، حرام زادے کو۔" دودھ نے پھر زور مارا۔

"نہیں بیٹے....! یہ آگ تو میرے سینے میں دہک رہی ہے۔" رنجنا نے دیپو کے سامنے اپنے غموں کا پٹارا کھول دیا۔

"نہیں ماں....! اَب تو مَیں کروں گا یہ کام۔" دیپو ایک جوش کے ساتھ ماں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

"اچھا....! لیکن ترکیب سے۔" وقت شناس ماں نے پھر آنچ کم کر دی۔

"وہ کیا...؟"

"آج شام تم چُھپ جانا، مَیں تمھارے میلا جانے کا بہانا کر دوں گی اس سے، اور اس کے سو جانے پر تم اُس کا پہلی ہی نیند میں کام تمام کر دینا، لے یہ چاقو روک....!" رنجنا نے اپنی کمر سے وہ چاقو نکال کر دیپو کے سپرد کرتے ہوئے کہا جس کو رنجنا کئی روز سے پتھر پر گھِس گھِس کر تیز کر رہی تھی۔

رنجنا نے گھر کے ضروری کاموں سے فراغت کے بعد بناؤ سنگار کر کے خود کو دُلھن جیسا بنالیا۔ بھانو، آج شام حسب وعدہ دس بجے سے سات آٹھ منٹ پہلے ہی آدھمکے۔ پھر منصوبے کے مطابق دیپو ایک کمرے میں چھپ گیا، اور رنجنا نے بھانو کو ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔

"کہاں ہے، دیپو..؟" رنجنا کے بناؤ سنگار کو دیکھ کر بھانو آپے سے باہر ہو گئے۔

"بس میلا جانے کی تیاری میں ہے۔" رنجنا نے بھانو کو بتایا۔

"جلدی بھیجو....!" بھانو تڑپے۔

"بس اُبھی بھیجتی ہوں، جب تک کھانا کھائیں، آپ۔" رنجنا نے بڑے سلیقے سے بھانو کو کھانا کھلایا اور ٹی۔ وی آن کر کے، دیپو کو جلد میلا بھیجنے کے بہانے کمرے سے باہر آ گئی، اور بھانو فلمی دھنوں میں کھو گئے۔ انتظار کا ایک ایک پل اُن کو بار بار کروٹیں بدلنے کے لیے مجبور کرنے لگا۔

"لا چاقو..! اور تیز کر دوں، ایک ہی وار میں کام ہو جائے، حرام زادے کا۔ دِل پر لگے سیدھا، تب بات ہے۔" رنجنا نے دیپو کے کمرے میں پہنچ کر دھیمی آواز میں چاقو طلب کیا، اور چاقو لے کر بڑے اطمینان سے راموکی تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اپنے پتی کی تصویر کو پہلے خوب دیکھا، پھر آنکھوں کے ذریعے دِل میں اُتار کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ہے بھگوان....! تمھارے بنا یہ جیون پہاڑ ہے، کانٹوں کا۔ کاٹے نہیں کٹتا۔" اُس نے اپنی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسو صاف کیے۔

"ہے بھگوان...! مجھے شکتی دو...! تا کہ مَیں بدلا لے کر تمھاری آتما کو شانتی دے سکوں۔" ایک جوش کے ساتھ اُس نے آنکھیں کھولیں اور بھانو کے کمرے میں داخل ہو گئی، بھانو نیم غنودگی میں تھے۔ رنجنا نے اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا، دیپو حالات کے تحت تیزی سے لپکا۔ دروازہ بند پا کر اُس نے کھڑکی سے جائزہ لیا۔ رنجنا نے دیپو کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دیپو پنجرے کے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

رنجنا نے دھڑکتے دِل پر قابو پاتے ہوئے لمبی سانس کھینچ کر چاقو اُوپر اُٹھایا، ایک پل رکی، اور اپنے سینے میں اُتار لیا۔ رنجنا کی چیخ سن کر دیپو نے چیختے ہوئے کواڑ ہلا ڈالے۔ بھانو نے اُچھل کر دروازہ کھول دیا۔

"ماں....! یہ کیا کیا، تو نے...؟" دیپو اندر داخل ہو کر چیخ پڑا۔

"سترہ سال بہت دکھ جھیلے مَیں نے، تیرے باپو کے بغیر، اَب تاب نہیں مجھ میں، مَیں نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری عورت میری طرح دکھ جھیلے۔" یہ کہتے ہوئے رنجنا نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

آوارہ

اِرم ہاشمی/میانوالی

اسے سڑک کے اُس پار جانا ہے۔

وہ لال بتی کے ہرا ہونے کا انتظار کر رہی ہے لیکن۔۔۔لال بتی ہے کہ ہری نہیں ہو رہی۔

وہ لال سے پیلی ہوتی ہے اور پیلی کے بعد اسے ہرا ہونا چاہئے لیکن وہ پھر پیلی ہو جاتی ہے ہری نہیں ہوتی۔

علم نہیں سرکٹ نہیں بنتا یا ہرا بلب خراب ہے۔

کوئی وجہ تو ہوگی کہ بتی ہری نہیں ہوتی۔

اور وہ سڑک کے اِس پار کھڑی ہے۔

دن کی روشنی مدھم ہو چکی ہے، اندھیرا ہونے کو ہے، درو دیوار، درختوں اور آسمانوں پر ہر طرف زردی اُتر آئی ہے۔

کاریں، بسیں، موٹر سائیکل، سائیکلیں، تیز رفتار گاڑیوں کی لمبی قطار ٹھہری گئی ہے اور اِن پر سوار کارخانے دار، بزنس مین، دفتروں کے آفیسرز، اُستاد، پولیس والے، عام آدمی، سودا سلف لینے کے لئے گھروں سے نکلی عورتیں، ٹیوشن سنٹرز کو جاتے بچے، ڈاکٹر، نرسیں سبھی کے سبھی ٹھہر گئے ہیں، لگتا ہے جیسے لال بتی کی وجہ سے سارے کا سارا بازار، سارے شہر، سب دنیا کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے، سب بے چینی سے بار بار گھڑی کو دیکھتے ہیں، ریلوے کا ایک ڈرائیور بار بار اپنی سائیکل کا اگلا پہیہ اُٹھا اُٹھا کر پٹخ رہا ہے، پریشانی کی وجہ سے اُس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا ہے کیونکہ جس گاڑی کو اسے لے کر جانا ہے، اس کے چھوٹنے کا وقت ہو چکا ہے اور وہ یہاں راستے میں قید ہو کر رہ گیا ہے، ٹیوشن سنٹرز کے زیادہ تر بچے خوش ہیں، جتنا وقت نکل جائے، اُتنا اچھا ہے، سر پر لوہے کی ٹوپی پہنے فوجی بار بار موٹر سائیکل کا ہارن بجا رہا ہے، لیکن آگے بڑھ نہیں پا رہا، وہ جانتا ہے کہ اگر دفتر پہنچنے میں دیر ہو گئی تو اُس کا کمانڈنٹ آفیسر چالیس کلو کا وزن پیٹھ پر لدوا کر دس کلومیٹر کا روڈ مارچ کروا دے گا، لوگ کھڑے کھڑے اُتاولے ہو رہے ہیں، غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔۔۔لیکن۔۔۔

لال بتی ان سب کے جذبات سے بے خبر ہے، بے نیاز ہے۔شاید بے حس ہے۔

یہاں صرف وہی پیدل نہیں ہے، پیدل چلنے والے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن ۔۔۔بہت سے لوگ بتی کے ہرا ہونے کا انتظار نہیں کر رہے، جُوں ہی تیز گاڑیوں کا ریلہ ذرا سا رُکتا ہے یا آہستہ ہوتا ہے تو وہ دوڑ کر آدھی سڑک پار کر لیتے ہیں، وہاں لمحے بھر کو رُکتے ہیں، دائیں اور بائیں دیکھتے ہیں اور باقی سڑک بھی پار کر لیتے ہیں۔

صاحب! کون لال بتی کے ہرا ہونے کا انتظار کرے!!!

اِس تیز رفتار زندگی میں کس کے پاس اتنی فرصت ہے۔

لیکن۔۔۔وہ کھڑی ہے اور انتظار کر رہی ہے اور بتی ہری نہیں ہو رہی۔

سب لوگ چلے جا رہے ہیں، بڑھتے جا رہے ہیں۔۔اور وہ کھڑی ہے۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا ہے کہ لال بتی کی پرواہ نہ کرے اور دوسروں کی طرح آگے چلتی چلی جائے۔

سڑک کے اُس پار سے ڈی ایچ کیو سٹریٹ شروع ہو جاتی ہے، جس کے دونوں اطراف دکانیں ہیں، انھی دُکانوں کے درمیان میڈی کیئر کا آفس ہے، جہاں وہ کمپیوٹر آپریٹر ہے، وہ کام کرتی ہے تو اُسے تنخواہ ملتی ہے، ہر روز واپسی پر لوٹتے لوٹتے شام ہو جاتی ہے اور فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے اُسے گھر کا خیال ستانے لگتا، شوہر کی بدگمانی سے وہ لرز اٹھتی، وہ جب سے بیمار ہوا تھا، شک اِس کے پاؤں سے لگ کر بیٹھ گیا تھا، دیر ہو جاتی تو وہ پاگل ہونے لگتا اور اُس کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا۔

لیکن وہ کیا کرے، اگر کام نہ کرے تو گھر کیسے چلے، اور اُس کی زندگی کی گاڑی کو مستقل لال بتی کا سامنا ہے، اِس لئے سڑک کے اُس پار جانا ضروری ہے، اُس نے سامنے دیکھا، موٹریں، گاڑیاں، سکوٹر تیزی سے بھاگتے جا رہے ہیں۔۔

اُس نے کچھ ہمت بٹوری۔

لوگ لال بتی کی پرواہ کئے بغیر سڑک پار کر رہے تھے، ربن باندھے ایک لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پار کر گئی تھی، بلیو جینز پہنے ایک لڑکا بھی لمحے بھر میں سڑک کے اُس پار تھا، وہ پھول بیچنے والا بھی ابھی کچھ دیر پہلے اِس طرف تھا تو اب اُس طرف ہے۔

اُس نے کچھ اور ہمت بٹوری۔

ابھی ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اُسے یوں لگا جیسے تیز دوڑتا، چنگھاڑتا ہوا اُونچا سا پہاڑ اُس کے اُوپر چڑھا آ رہا ہے۔

اُس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

بڑے زور کی بریک لگی تھی۔

ایک تیز رفتار گاڑی ایک چیخ کے ساتھ اُس کے قریب آ کر رکی تھی۔

وہ گاڑی کی زد میں آتے آتے بچی۔

اگر وہ جلدی سے دو قدم پیچھے نہ ہٹ گئی ہوتی تو اِسی کار کے نیچے زخمی ہو کر تڑپ رہی ہوتی۔

اُس کی جان بچ گئی تھی۔

لیکن اُس کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھے آدمی کی آنکھیں لال بتیاں بن کر اُسے غصے سے گھور رہی تھیں۔

اِتنے میں اُس کے کانوں میں کار والے کی آواز پڑی۔

''مرنا ہے''۔ ''تمہارے لئے لال بتی ہے، پھر بھی گھسی چلی آ رہی ہو، ذرا صبر نہیں ہوتا!! ابھی گاڑی کے نیچے آ جاتی تو خود بھی مرتی اور ہمارے لئے بھی مصیبت کھڑی کر دیتی''۔

اور پھر اُس کے کانوں میں گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی جو تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ ابھی تک سڑک کے اِسی پار کھڑی ہے۔

تھوڑی دیر پہلے کے حادثے کا اثر ابھی تک اُس کے ذہن پر ہے لیکن وہ کھڑی سوچ رہی ہے کہ کیا کرے۔

گھر پہنچ بھی گئی تو کیا کہے گی!!

''لال بتی کی وجہ سے سڑک پار نہیں کر سکی''

کیا اُس کی بات پر یقین کر لیا جائے گا؟؟

شوہر کیا سوچے گا'' آوارہ ہے''

لڑکا پریشان ہوگا'' ماں آوارہ ہے''

کام پر نہیں جاؤں گی تو زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟؟

شام ڈھل چکی تھی اور وہ آوارہ بنی اَب بھی سڑک کے اُس پار کھڑی ہے۔

معلوم نہیں، کب تک!!

لبنٰی صفدر/ لاہور

یقین کی طاقت

خدا نے میرے حق میں ہمیشہ بہتر لکھا
ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ خدا سب سے بہتر جانتا ہے
میں نے محبت کی آنکھ سے دیکھا
جب تمہارے دل سے محبتوں کے چشمے پھوٹے
ہماری بنجر زمینوں پر
گلاب کاشت کرنے کا موسم آ گیا تھا
میں نے حیرت کے سمندر سے آسمان کی جانب دیکھا
خدا کس طرح قسمت کے ستارے کو
گردشوں سے نکال کر
راہِ راست پہ لے آتا ہے
خدا جو تمام محبتوں کا امین ہے
یقین کا جگنو گمان کے راستوں پر
ہمیشہ چمکتا رہتا ہے
ہمارے وہم کی دھول ہماری آنکھوں پر
جم کیوں جایا کرتی ہے
ستارے آسمانوں پر نہیں
آنکھوں کی چلمنوں پر مسکراتے ہیں
(میں نے آنسوؤں کی بات نہیں کی..)
چاند تو ہمیشہ روشنی کا سفیر بن کر آتا ہے
ہم غلط راستوں پر جانے کے
اگر خود غلط فیصلے کرتے ہیں
تو اس میں خدا کا کیا قصور
اس نے ہماری تمام حسیں بیدار رکھی ہیں
ہماری لاپرواہی نے انہیں سلا رکھا ہے
یقین جانو: وہ تمام فیصلے وہی کرتا ہے
جو ہمارے دلوں کی خواہش کے
عین مطابق ہوتے ہیں
اگر ایسا نہیں ہوتا تو سمجھ لو
ہمارے دل کھوٹے سکے ہیں

مکمل

ہماری نظمیں ادھورے پن کے عذاب میں تھیں
اور تمہاری غزلوں کو بھی
ناتمامی کا دکھ تھا شاید
اداس موسم ویران بنگلے کی جالیوں میں
اپنی بانہیں ڈالے چپ چاپ ساکن کھڑے تھے
اور پھر اک چاپ نے
اداسیوں کے ظالم سکوت کو توڑ ڈالا
ہمارے لفظوں نے
تمہاری آنکھوں کی روشنی سے ملاپ کر کے
اک نئے رشتے کی بنیاد رکھ لی
پھول کا رنگ روپ مکمل ہو گیا
تمہارے سخن نے بھی گلاب رنگ کا لباس پہنا
یاد آیا میرے لباس اور میرے گہنوں کا رنگ بھی
تیرے سخن سے ملتا جلتا ہے
چاندنی، عاشقی، کیسری، دلبری
حاتھوں میں ہاتھ ڈالے
چہار جانب ہی رقص میں ہیں
دل کی سیلن زدہ دیواروں پر
یاسمین کی بیلیں لپٹ رہی ہیں
ہم اس جنگل سے راستہ نکال کر
سمندر کے اس ساحل پہ جا نکلیں گے
جس کا اک جزیرہ
ہمارے نام سے منسوب ہے
تم آسمان سے کچھ ستارے توڑ لانا
میں گھر کی پیشانی پر کہکشاں سجاؤں گی
تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں
ابد کا نغمہ گنگنا رہا ہے
اپنے قدموں کی رفتار کو ذرا سا دھیمہ کر لو
کہ ایک ننھا سا قہقہہ
ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے

شاعری

ہم تو سادہ ہیں مگر "کار" سمجھ لیتے ہیں
آپ کے شہر کے اسرار سمجھ لیتے ہیں
ہم نے لفظوں کے بہت کھیل ہیں کھیلے صاحب
آپ کے حکم کو سرکار سمجھ لیتے ہیں
بے وفائی کے لیے لاکھ بہانے ڈھونڈیں
آپ کی چال وفادار سمجھ لیتے ہیں
کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے مجھ کو
میرے حالات سبھی یار سمجھ لیتے ہیں
ان کے ارشاد کی تفہیم کہاں ہے مشکل
لوگ غالب کے بھی اشعار سمجھ لیتے ہیں
ایک گوشے میں جو بیکار پڑے رہتے ہیں
گھر کی ہر چیز وہ بیکار سمجھ لیتے ہیں
جو مری فطرتِ فولاد نہیں سمجھیں گے
اس کی افتاد کو لوہار سمجھ لیتے ہیں
ہم ہیں خوش فہم یہ عادت ہے پرانی ثاقب
سر پہ الزام کو دستار سمجھ لیتے ہیں

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

اسی تڑپ، اسی میلان میں خدا ملے گا
قریب آ، تجھے انسان میں خدا ملے گا
پکار حضرتِ انسان کے لیے لبیک
تجھے اسی رہِ آسان میں خدا ملے گا
کتابِ عقل و خرد کھول اور پڑھ اس کو
تجھے کتاب کے عنوان میں خدا ملے گا
یہ اُس کا حق ہے اُسے کھوجنے دے، سوچنے دے
جو سوچتا ہے کہ شیطان میں خدا ملے گا
جسے شوال سے لے کر رجب تلک نہ ملا
اسے کہاں مہِ رمضان میں خدا ملے گا
نکل پڑا دلِ زائر خلوصِ نیت سے
خبر ملی تھی کہ ایران میں خدا ملے گا
ملا نہ تجھ کو کہیں اور تو ضرور تجھے
یہیں کہیں دلِ حیران میں خدا ملے گا
زمیں سے تا بہ خلا مستقل تحرک ہے
سو طے ہوا ہے کہ ہیجان میں خدا ملے گا
اُٹھائے پھرتا ہوں تسبیح بھی صلیب کے ساتھ
مجھے اسی سرو سامان میں خدا ملے گا
ہمارے چشمۂ زم زم کو بھی خوشی ہوگی
اگر تجھے ترے اشنان میں خدا ملے گا
اگر یقیں ہے تو پھر کعبہ و کلیسا کیا
یہیں کہیں ترے دالان میں خدا ملے گا
تمہارے پوپ کو تکلیف اس میں کیا ہوگی
اگر مجھے مرے بھگوان میں خدا ملے گا
ملا نہیں جسے خود میں کلام کرتا ہوا
اُسے کہاں بتِ بے جان میں خدا ملے گا
ہمارا دین تو ناصر علی محبت ہے
اسی طرح کے مسلمان میں خدا ملے گا
جو آنکھ رکھتے ہیں ناصر علی انہیں فوراً
ہمارے دیدۂ ہلکان میں خدا ملے گا

ناصر علی/لاہور

حسرتیں دل کی کرو شوق سے پوری اے دوست
عشقِ ممنوع سے بچنا ہے ضروری اے دوست
یوں تو اُس بزم میں ہم شوق سے کھل کر بولے
رہ گئی دل کی مگر بات ادھوری اے دوست
اک طرف عقل ہے اور دوسری جانب دل ہے
اک فسادی ہے یہاں، اک ہے فتوری اے دوست
ٹوٹ جائے نہ یہ تھوڑا سا تعلق مل کر
ایسے حالات میں بہتر ہے یہ دوری اے دوست
آج پھر دیکھ لیا ظرف تمہارا، میں نے
مجھ کو ناری ہی کہو تم تو ہو نوری اے دوست
اب بدلنے کو ہیں حالات، ذرا صبر کرو
مت کرو غم، کہ یہ ہے دورِ عبوری، اے دوست
ٹھیک ہی کہتے ہو، یہ سچ ہے کہ ناداں ہے جلالؔ
تم تو دانا ہو، کرو بات شعوری اے دوست

سیّد قاسم جلال/بہاولپور

درد کے تیر جگر پار ہوا کرتے تھے
ہم محبت کے سزاوار ہوا کرتے تھے
اپنی اس ایک محبت کو چھپانے کے لیے
جرم تب ہم سے لگاتار ہوا کرتے تھے
نفسانفسی کا زمانہ نہیں ہوتا تھا کبھی
لوگ اُلفت کے طلب گار ہوا کرتے تھے
آگ اور خون کی ہولی سے جو ویران ہوئے
یہ علاقے بھی سمن زار ہوا کرتے تھے

ان پہاڑوں کو بھی ڈھابوں کے لیے کاٹ دیا
جن پہ گندھارا کے آثار ہوا کرتے تھے
سامنے بیٹھے ہیں جو پہلو میں لیے اوروں کو
ہم بھی ان کے کبھی دلدار ہوا کرتے تھے
فیصلے اب بھی سرِ دار ہی ہوتے ہیں یہاں
فیصلے تب بھی سرِ دار ہوا کرتے تھے

تسنیم کوثر/لاہور

ان دنوں آپ کہاں ہوتے ہیں کم ملتے ہیں
اور اگر ملتے ہیں بادیدۂ نم ملتے ہیں
جس طرف جاؤں ترے شہر کی سڑکوں پہ مجھے
چار سو پھیلے مرے گاؤں کے غم ملتے ہیں
ہم خطاوارِ محبت ہیں سزاوارِ جنوں
جانے کس راہ پہ چلتے ہوئے ہم ملتے ہیں
ہم پہ گزرا ہے الم سہمی ہوئی راتوں کا
سلسلے درد کے دن سے بھی بہم ملتے ہیں
گھر سے نکلے تھے جو تقدیر بنانے کے لیے
خاک ملتی ہے کہیں نقشِ قدم ملتے ہیں

نیازت علی نیاز/لاہور

عجب مسئلہ تھا جو بس میں نہیں تھا
وہ میرا تھا اور دسترس میں نہیں تھا
دھڑکتا تھا دل بن کے وہ میرے اندر
مگر وہ کسی میری نس میں نہیں تھا
ان آنکھوں کی تاثیر کا ہے یہ جادو
نشے میں بھی ہو کر ہوس میں نہیں تھا
سرور اُس کے ہونٹوں کی تھا پنکھڑی کا
یہاں جو کسی گل کے رس میں نہیں تھا
یہاں رشتے تو آٹھ دس آئے اُس کے
ستم یہ ہے میں آٹھ دس میں نہیں تھا
گزرتے گئے یونہی دن اور مہینے
کہ ملنا کسی بھی برس میں نہیں تھا
مری جاں پرندے میں تھی قید طاہرؔ
مگر وہ پرندہ قفس میں نہیں تھا

طاہر عدیل/ڈنمارک

آپ سے بات کی تمنا ہے
اک ملاقات کی تمنا ہے
جس میں ہم ایک دوسرے سے ملیں
اس حسیں رات کی تمنا ہے
عشق کے پاس حُسن خود آئے
ان کرامات کی تمنا ہے
جب وہ ابھریں تو پھول کھل جائیں
ایسے جذبات کی تمنا ہے
تیرے دکھ درد کا ہوں بیوپاری
تیرے صدمات کی تمنا ہے
زندگی کی اداس راہوں میں
آپ کے ساتھ کی تمنا ہے
وہ تو بچھڑا ہے یار سے، اُسے اب
بس خرابات کی تمنا ہے

شہزاد عامر/گوجرہ

مصلحت کے دور میں منصور سارے بک گئے
دیدہ ور اندھے ہوئے دستور سارے بک گئے
شاہ کے لعل و جواہر کام اپنا کر گئے
جتنے تھے اہلِ قلم غیور سارے بک گئے
سارے دانشور ہوئے دینار کے زیرِ اثر
اہلِ حق اس شہر کے مشہور سارے بک گئے
ان کی نظروں کی عجب دیکھی کرشمہ سازیاں
ایک جنبش پر یہاں مغرور سارے بک گئے
اس یزیدی دور میں جھوٹوں کی چاندی ہوگئی
بااصولوں کے لکھے منشور سارے بک گئے
پیٹ خالی، اپنے بچوں کو بلکتا دیکھ کر
چند سکوں پر یہاں مزدور سارے بک گئے
تخت پر شہزادؔ جیسے ہی یزیدی آ گئے
ایک پل میں صاحبِ جمہور سارے بک گئے

شہزاد عامر/گوجرہ

کام سے کام رکھتا آدمی ہوں
اس لیے کافی تنہا آدمی ہوں
ڈر رہی ہو بلا وجہ مجھ سے
میں کوئی ایسا ویسا آدمی ہوں
کیا مرے ساتھ رہ سکو گی تم؟
کیونکہ میں کافی بگڑا آدمی ہوں
آپ کو جس طرح کا چاہیے تھا
ہو بہو اس طرح کا آدمی ہوں
ایسے بھی کرتا ہے بھلا کوئی
میں بھی کتنا انوکھا آدمی ہوں
وہ تو منٹوں میں سیدھا کر دے گی
چاہے جتنا بھی ٹیڑھا آدمی ہوں

ایک بار آزما کے دیکھو تم
اپنے نزدیک اچھا آدمی ہوں
کچھ تو حلیہ ہی ایسا ہے میرا
کچھ محبت میں شکستہ آدمی ہوں
ایسا کچھ خاص تو نہیں مجھ میں
عام سا اور گزارہ آدمی ہوں
اس کی ہر بات پر یقین کیا
گل فراز اتنا سادہ آدمی ہوں

گل فراز/ہڈالی خوشاب

اس نے قدم جو میرے گھر وعدے کی شام رکھ دیا
ہاتھوں پہ اُس کے میں نے سرِ وقت سلام رکھ دیا
اک مئے کدے میں بزم تھی اُس بزم میں تھے یار دوست
دیکھا جو اُس کی آنکھ میں سب نے ہی جام رکھ دیا
خوشبو گلاب چاندنی بادِ صبا کی تازگی
جو بھی پسند آ گیا اُس کا وہ نام رکھ دیا
اُس نے نظر اُٹھائی تو ہم نے غزل سنائی پھر
اُس نے نظر جھکائی تو ہم نے کلام رکھ دیا
کہنی تھی دل کی بات پر وہ نرم خو تھی اس لیے
بادِ صبا کے ہاتھ پر ہم نے پیام رکھ دیا

اقبال پیام شجاع آبادی

تتلیاں اور گلاب تیرے نام
میری آنکھوں کے خواب تیرے نام
اس میں رکھے ہوئے ہیں مور کے پر
چاہتوں کی کتاب تیرے نام
ان میں تو ہی دکھائی دیتا ہے
جھیل اور ماہتاب تیرے نام
پھول ہوں شعر ہوں کے آنسو ہوں
میرا ہر انتخاب تیرے نام
تیرے الزام سارے میرے سر
میرے سارے ثواب تیرے نام
تپتے دن سارے نذر آصف ہیں
جو بھی ٹھنڈی ہے شام تیرے نام

آصف نیاز/لاہور

محسن دل کے راستوں پر جب گزر اُس نے کیا
دل تو دل تھا روح تک بھی تھا سفر اُس نے کیا
یہ اشاروں کی زباں اُس نے بتائی تھی مجھے
میں تو سادہ آدمی تھا باہنر اُس نے کیا
چاند کیا میں تو ستاروں کو نہیں تھا جانتا
اس اندھیری رات کو آ کر سحر اُس نے کیا
مسکراہٹ کی بہار آئی ہے اُس کے آنے سے
ایک چھت اور چار دیواری کو گھر اُس نے کیا
عین اس جا پر کبھی آسیب بھی آباد تھا
دل بھی پہلے دشت تھا اس کو نگر اُس نے کیا
اُس نے سکھلایا مجھے ظالم کا رستہ روکنا
میں بہت کمزور تھا مجھ کو نڈر اُس نے کیا
کہہ رہے ہیں بے خبر عشاق خود کو باخبر
پھر خبر آئی نہ جس کو باخبر اس نے کیا

وجاہت تبسم/گجرات

وطن کی آن

یہاں گذر و بسر کرنے ضرورت ہم کو پانی ہے
جبھی تو قوم کی سوچوں میں تبدیلی سی لانی ہے
شتابی مل کے ہم اپنے مسائل حل بھی کر لیں گے
بنا کر ڈیم دریاؤں پہ پانی ان میں بھر لیں گے
بچانے کی بھلی عادت ہم اپنے دل میں ڈالیں گے
دیامر اور بھاشا ڈیم بھی سب مل کر بنا لیں گے
وطن ہم سے مخاطب ہے کہ قومی سوچ اپناؤ
ملا کر سب کو ساتھ اپنے تم اپنا کام کرتے جاؤ
نہ سوچو تم کہ چھوٹا سا تمھارا کارخانہ ہے
کہ محنت سے ہی چھوٹوں نے بڑا بن کر دکھانا ہے
زراعت ہو، معیشت ہو کہ انسانی حوالے ہوں
وطن کی آن پر بسمل کبھی ہم مٹنے والے ہوں

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

سوتے

جھکڑ کی طرح چلتی ہوئی
ہواؤں کے گزرنے کا گماں لیے
کبھی خاموش کبھی جلتی ہوئی آرزو
دل کے پھاٹکوں پر کوئی دربان نہیں
لچکیلی شاخوں کا دل کسی شجر پر اُلجھا پڑا ہے
نینوں کے کٹوروں میں
سمندروں کی بھا چاہے
قفل کبھی زبانوں پر نہیں لگتے
زنگ آلود رہیں اپنے لیے
زنجیروں کا انتخاب کرتی ہیں
سو میرے محترم میرے محبوب
ان دیکھے شکست خوردہ
لمحوں کی تحویل سے کیسے نکلوں
آرزو کے سارے سوتے
خشک ہو چلے ہیں

آسناتھ کنول/لاہور

چیئرمین کا بندہ

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

کوئی بھول چوک ہو جائے یا وہ دفتر وقت پر نہ پہنچ سکے، دفتری اخراجات کے معاملے میں بھی اکثر اوقات وہ ہیرا پھیری کر جاتا تھا۔ دفتر کی چیزوں کے اخراجات میں بھی وہ کبھی کبھار پیسے ٹک لیا کرتا تھا الغرض کہ اس کے مزے ہی مزے تھے۔ نہ رہ سکا تو میں نے ایک روز چیئرمین سے پوچھا لیا کہ وہ میرے پڑوسی بھی تھے اور ہمارے یونین کونسل کے سربراہ بھی تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک آنکھ دبائی اور فرمایا، دراصل وہ میرا بندہ ہے ہمارے دفاتر میں کچھ بندے ایم۔ پی۔ اے کے ہیں ظاہر ہے میرا ورکر ہے تو میں ہی اپنے بندے کا خیال رکھوں گا اس لئے افسروں کا اس پر دھیان نہیں پڑنے دیتا۔ اب میں اس روز سے سوچ رہا ہوں اگر کوئی اللہ جل شانہ ہو کا بندہ بن جائے یا رب کریم کہہ دیں یہ میرا بندہ ہے یا یہ فرمادیں یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے پھر اس کا کام تو بن گیا ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابیاں اس کے قدموں پر نثار ہونے کو بے قرار ہوں گی۔ اگر کوئی چیئرمین کا بندہ ہے۔ ایم پی اے کا بندہ ہے۔ نواز شریف یا آصف علی زرداری کا بندہ ہے تو وہ اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں اگر کوئی رب کا ورکر ہو یا بن جائے تو کیا خیال ہے وہ اس بندے کو اکیلا چھوڑ دے گا۔ یقیناً وہ اس کی خطاؤں کے بدلے عطاؤں والا معاملہ کرے گا، کوتاہیوں پر معافی اور درگزر کی چادر تان دے گا جو اس نے اپنی جان پر ظلم کئے انہیں معافی کے پانی سے دھو دے گا۔ جفاؤں کے بدلے وفاؤں والی اس کی پرانی ریت ہے رب کسی کے اندازے میں نہیں آ سکتا اس لئے وہ دیتا ہے تو بے انداز دیتا ہے۔ وہ محبت کرنے والوں کو پہچانتا ہے وہ کیسا سخی مالک ہے کہ ایک تو بادشاہ وہ اچھا ہوتا ہے جو معاف کر دے اور جو معاف بھی کر دے اور بہت کچھ دے کر بھی بھیجے تو ایسا دیالو اور شہنشاہ کہاں ملتا ہے۔ اسی سلسلے میں سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق جہاندے ہڈیں رچیا اوہ رہندے چپ چپاتے ہو
لوں لوں دے وچ لکھ زباناں اوہ پھردے گنگے باتے ہو
اوہ کردے وضو اسم اعظم داتے دریا وحدت نہاتے ہو
تدوں قبول نمازاں باہو، جد یاراں یار پچھاتے ہو

جب رب کی محبت غالب آ گئی تو پھر ہر روئیں سے جسم و جاں کے ہر مسام سے محبت ہی کی آواز ابھرے گی ہر بال ہر مسام پر وہی لبادہ وہی چولا نظر آئے گا پھر جسم کے اک اک بال میں ہزاروں زبانوں کی طاقت عود کر آئے گی۔ چیئرمین، گورنر اور وزیر اعظم کسی کو کیا دے سکتا ہے وہ تو خود محتاج ہے وہ تو ایک ایسے ستارے کی مانند ہے جس کے بارے کہا گیا۔

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں

جو خود خجل خوار ہو رہے ہیں وہ کسی کی قسمت کیا سنواریں گے جبکہ دوسری طرف شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے اگر بندہ اس کا "کاما"☆ بن جائے تو پھر اس کامے کو دنیا کا سب سے بڑا چودھری کہنا پڑے گا کہ دوستی اس سے ہو گئی جو مشرق و مغرب سے بھی پرے کائنات نہیں کائناتوں کا مالک ہے اور اگر وہ کہہ دے کہ: یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

تو کیا کہنے کیسی خوش نصیبی یقینی ہو گی، پھر آٹے دانے یا روٹی کپڑا، مکان کا تو مسئلہ ہی نہیں۔ دنیا کی سرداری ان کی ٹھوکر میں آ جاتی ہے جنہیں وہ اپنا بنا لیتا ہے کہ یہ تو تعلق کی بات ہے اور جب تعلق بن جاتا ہے تو پھر بندہ رب سے سب کچھ بے دھڑک کہہ دیتا ہے۔ کل پھر میں چیئرمین سے ملا کہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں ان کے بندے کا پوچھا۔ کہنے لگے موج میں ہے جو چاہے کرتا ہے جیسے چاہے کرتا ہے پوری میونسپل کمیٹی اس کے تصرف میں ہے۔ میں پھر سوچنے لگا چیئرمین کے خلاف تو عدم اعتماد بھی ہو سکتا ہے وہ برطرف بھی ہو سکتا ہے نہ بھی ہو تو چار سال بعد اس کے اقتدار اور اختیار کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد وہ بے وقت بے قیمت اور بے حیثیت ہو جاتا ہے مگر رب تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ابتداء اور انتہا سے پاک ہے اس کا اقتدار اور اختیار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے تو پھر چیئرمین کا جو بندہ بنا اس سے کہیں زیادہ رب کے ورکر کو سہولتیں حاصل ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے۔

ا: ساری کی ساری طاقتیں رب کریم کے پاس ہیں۔

۲: یہ ساری طاقتیں رب کے بندے کے ساتھ ہیں۔

پھر کیا ہوتا ہے پھر اس بندے کو رب اپنا بنا لیتے ہیں پھر وہ ایسا بن جاتا ہے کہ اس کے جذبات یا اظہار کے لئے باتوں کے محتاج نہیں رہتے پھر وہ زندگی کے معجزے کو ایک حقیقت سمجھتا ہے پھر اسے خلوت در انجمن والی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے یعنی وہ اکیلا ہو یا محفل میں ہو رب کو نہ ہی بھولتا ہے نہ ہی اس کا ذکر کرنے سے غافل ہوتا ہے مگر بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو رب کے ورکر بنیں۔

محبت کا راستہ دشوار گزار ہونے کے باوجود رب کے ورکر کے لئے آسان اور سہل ہوتا ہے کہ یہ ہمارے اندر کی آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آنکھ کھل جائے تو صحیح سمت کی طرف گامزن ہونا کوئی مشکل نہیں لگتا کہ سمتیں مقرر نہیں کی جاتیں وہ تو روز اول سے موجود ہوتی ہیں ہمیں صرف انہیں اپنانا ہوتا ہے۔ رب کی ہستی کتنی بلند ہے یہ صرف رب ہی جانتے ہیں ان سے تعلق بنا لینے والے بھی بلند ہو جاتے ہیں۔ عظیم ہو جاتے ہیں یہ رب ہی جانتے ہیں کہ یہ کتنا خوبصورت تعلق ہے، چیئرمین کا بندہ چیئرمین سے سوال کر لے گا اور رب کا ورکر رب سے سوال کرے صرف اور صرف رب سے! اگر وہ کسی اور سے سوال کرے تو رب کو غیرت نہ آئے گی یہ کتنی بڑی بے قدری ہو گی کاش مسلمان عمومی طور پر اسے اپنا بنا لیتے تو پھر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی چاکری کی کوئی ضرورت ہی نہ رہتی۔ مسلم امہ پوری امت اگر دین کو اپنا بنا لیتی تو پھر کسی کے آگے جھکنے کسی سے قرض لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور یہ کوئی افسانہ نہیں حقیقت ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں صحابہ کرام نے روم اور فارس فتح کر لئے جو اس زمانے کے روس امریکہ اور برطانیہ کی طرح کے ملک تھے مگر اس سب کے لئے اس طاقتوں والے رب کا بندہ اور ورکر بننا ضروری ہے۔

☆ پنجاب کے دیہات میں بڑے زمیندار کے ملازم یا نوکر کو کاما کہتے ہیں۔

پیرو کا تکنا

عامر بن علی

تین کروڑ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا انیسواں بڑا ملک پیرو براعظم شمالی و جنوبی امریکہ کا قدیم ترین تہذیبی مرکز ہے۔ یہ دیس انسانی تاریخ کے قدیم ترین تمدن "ان کا" دارالحکومت تھا اور "ان کا" سلطنت جو تقریباً پورے جنوبی امریکہ پر حکومت کرتی تھی، اس کا سربراہ اسی ملک کے شہر "ماچو پیچو" میں اپنا دربار لگاتا تھا۔ میسوپوٹیمیا، بابل و نینوا کو بھی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر وہاں مرکزی حکومت ایسی مضبوط نہیں تھی جیسی "ان کا" تہذیب میں تھی۔ اس کے علاوہ جس قدر پھیلی ہوئی یہ سلطنت تھی، ویسی میسوپوٹیمیا، بابل و نینوا میں یقیناً نہ تھی۔ جدید پیرو کی تاریخ دو صدیاں پہلے ہسپانوی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ تین صدیوں پر محیط اس سرزمین کے نوآبادیاتی عہد کی یادگار ملک کی قومی زبان ہسپانوی ہے۔ "آمارا" اور "کیچوا" بھی قبائلی علاقے میں رائج مقبول زبانیں ہیں۔ مگر سرکاری زبان سپینش ہے۔ اگر تہذیبی ارتقاء کی بات کی جائے تو میری نظر میں وادی سندھ کی تہذیب، جس کے مراکز ہڑپہ اور موہنجوداڑو تھے۔ اپنے وقت میں دنیا کی تمام تہذیبوں سے جدید تر تھی۔

"ان کا" تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب ضرور قرار دیا جاتا ہے چونکہ "انڈس تہذیب" چار سے پانچ ہزار سال پرانی ہے جبکہ "ان کا" سات ہزار سال پرانی ہے اور میسوپوٹیمیا بھی، مگر ماچو پیچو کے آثار دیکھیں تو یہاں پتھر کے زمانے کا گمان ہوتا ہے، سب کچھ پتھروں کو تراش خراش کے بنایا گیا ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں تو سب کچھ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے، حیرت انگیز طور پر ان اینٹوں کا سائز وہی ہے جو آج بھی دنیا میں معیاری و مستعمل سائز تسلیم کیا جاتا ہے۔ آثار میں ملنے والے ظروف مٹی سے بنائے گئے ہیں، کھیتی باڑی کے جو آلات ملے ہیں وہ جدید دور کے لگتے ہیں۔ چند سال پہلے میں نے نامور ادیب، دانشور اور صحافی منو بھائی کے ساتھ ہڑپہ کے تاریخی آثار کا دورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب جسے "انڈس سویلائزیشن" اور سندھ ساگر کی تہذیب کہا جاتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج تھا، یہاں کھانا مفت ملتا تھا، کھدائی میں کہیں بھی جنگ کے آلات نہیں ملے ہیں، حالانکہ کھیتی باڑی کے بہت سے آلات ملے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سماج شاید کسی وبائی مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ یا پھر کسی دوسری قدرتی آفت کا شکار ہو گیا ہوگا۔

پیرو کا تذکرہ کریں تو ایمازون کے جنگل اور دریا کا ذکر در آتا ہے، یا پھر آندیس کے پہاڑوں، ماچو پیچو کی چوٹیوں، ان کا سلطنت اور ہسپانوی نوآبادیاتی عہد اور اس کے اثرات کا ذکر، مگر میں یہاں ایک چھوٹے سے شہر کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی پاکستانیوں کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے، جنوبی امریکہ کے ملک چلی کی سرحد پر واقع اس شہر کا نام تکنا ہے۔

جی ہاں! تکنا شہر کا نام بھی ہو سکتا ہے، اگر آپ تکنا کا مطلب شوق سے دیکھنا سمجھے ہیں تو پھر آپ کا اندازہ غلط ہے۔ اس وقت میری مراد پیرو کے جنوب میں واقع اس ملک کے دسویں بڑے شہر سے ہے۔ یہ واقعی قابل دید ہے۔ لہٰذا اگر آپ کا اندازہ نگاہ شوق تھا تو پھر بھی کچھ زیادہ غلط نہیں تھا، کیونکہ تکنا کو ان معنوں میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ چلی کے آخری شہر سے فقط بیس میل کی دوری پر واقع تکنا اور اریکا شہر کی مثال راولپنڈی اور اسلام آباد جیسی ہے۔

آج کل یہاں آباد پاکستانیوں کی تعداد محض دس، پندرہ افراد تک محدود ہو گئی ہے۔ مگر کسی زمانے میں یہ دو، تین سو کے قریب ہوتے تھے۔ ان سب کا تعلق جاپانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے تھا۔ اس کے علاوہ بھی چند کاروباروں میں یہ لوگ شریک رہے ہیں۔ مگر زیادہ افراد اب بھی گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں۔ پرانی گاڑیوں کی درآمد پر پابندی کی وجہ سے زیادہ تر پاکستانی اس ننھے سے شہر سے ہجرت کر گئے ہیں۔ شہر میں ایک عالیشان آباد مسجد ہے جو پاکستانیوں نے تعمیر کی ہے۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی یہاں باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ اس پرشکوہ مسجد کو دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

پورے ملک میں یہ شہر اپنے جذبہ حب الوطنی کے سبب مشہور ہے، 1820 سے شروع ہونے والی جنگ آزادی جس کے سبب 1824 میں ملک کو آزادی ملی۔ اور پھر چلی کے ساتھ 1888 میں جنگ بحرالکاہل میں اس شہر نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ پیرو کی آزادی کی تحریک کا آغاز اسی شہر سے 1811 میں ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملک وجود میں آیا۔ اسی شہر کو پیرو اور بولیویا کی مشترکہ ریاست کے دارالخلافہ رہنے کا بھی اعزاز حاصل رہا ہے۔ گو کہ یہ یہ اشتراکی ریاست فقط چار سال ہی قائم رہ سکی تھی۔

اس شہر کی تاریخ میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب جنگ بحرالکاہل میں چلی نے یہ شہر فتح کر لیا اور اگلے پچاس سال تک یہاں پر اسکی حکومت رہی۔ 1930 میں ایک معاہدے کے تحت یہ شہر پیرو کو واپس مل گیا۔ مگر اگلے دو شہر جو چلی کے ابھی قبضے میں تھے، ان پر اپنا حق حاکمیت منوالیا۔ حالانکہ وہ پیرو کا صدیوں سے حصہ چلے آرہے تھے۔ گزشتہ صدی کی ابتدا میں یہ شہر اٹلی سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی مقبول و معروف منزل رہا۔ جنگ اور اس کے بعد کے حالات نے اس میں کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ مگر اب بھی شہر کی آبادی میں آپ کو اطالوی

خاندانی نام کثرت سے ملیں گے۔

شہر کے عین وسط میں ایک قدیم کیتھولک کلیسا ہے۔یہ چوک شہر کا مرکزی نقطہ بھی ہے اور سماجی گہما گہمی کا مرکز بھی ،ایک شام اس چرچ کی خصوصی عبادت کے بعد ایک قطار میں کھڑے لوگ باری باری پادری سے سلام لے رہے تھے۔سیاحتی نقطہ نظر سے میں پہلے کلیسا میں اس پادری کا خطاب بھی سن چکا تھا اور اب ثقافتی آداب بجالاتے ہوئے لوگوں کے ساتھ قطار میں بھی کھڑا ہوگیا تھا۔میری باری آئی تو پادری نے میرے ساتھ سلام لیتے ہوئے بایاں ہاتھ بلند کر کے اس کا مکا بنایا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا دیا۔اس نعرے کو سن کر سبھی لوگ مسکرانے لگے۔

کبھی یہاں ٹیکس فری زون قائم تھا جہاں دنیا بھر سے سرمایہ کار آتے تھے۔یہ وہ وقت تھا جب یہاں پاکستانیوں کا طوطی بولتا تھا۔نوے فیصد پاکستانی ری کنڈیشن گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے اور انتہائی مالدار تھے۔مگر کاروباری ناموافق حالات کے سبب اب فقط چند ہی لوگ باقی بچے ہیں۔

تکنا سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ساحلی شہر ایلو ہے جس کا نام سن کر ماضی کا مقبول بھارتی گانا ’’ILU ILU‘‘ یاد آتا ہے۔وہاں ایک دوست نے اپنے ویزے کی مدت میں توسیع کے لیے درخواست بمع رشوت جمع کروا رکھی تھی۔خیر ہم دستاویزات وصول کرنے کے لیے گئے تو دن دیہاڑے دفتر میں شراب کا دور دورہ چل رہا تھا۔پہلے تو مجھے جھٹکا لگا کہ میرے دوست کو شاید ایڈریس کی بابت کچھ غلطی لگ گئی ہے۔مگر ایسا نہیں تھا، وہ واقعی امیگریشن کا دفتر تھا۔میں نے اس ماحول اور موسیقی کے ساتھ رقص وغیرہ کا سبب پوچھا تو پتا چلا کہ آج ایک دفتری کارکن کی سالگرہ ہے۔اس لیے تھوڑا بہت جشن چل رہا ہے۔سب سے بڑے افسر نے ہاتھ میں بڑی بوتل پکڑ رکھی تھی۔ہمیں بھی اس نے شراب پینے کی دعوت دی۔میرے دوست نے بہانہ کر دیا کہ اس نے گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔اس لیے نہیں پی سکتا، جب میں نے بھی انکار کیا تو مذکورہ افسر طنزیہ کہنے لگا کہ کیا آپ دونوں نے ہی گاڑی چلانی ہے؟انہوں نے مذاق ضرور کیا مگر پینے پر اس سے زیادہ اصرار نہیں کیا، اور ہمارا کام بھی ہوگیا۔کیونکہ پورا دفتر ہی آج فیاضی پر آمادہ تھا اور سخاوت سے کام لے رہا تھا۔

اپنی نصف زندگی عالم کفر میں گزاری لیکن صرف ایک بار شراب پینے کے لیے اصرار کا سامنا کرنا پڑا، جنوبی افریقہ کے جہاز میں اکانومی کلاس کی تین نشستوں والی سیٹ پر میرے برابر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔معانقے کے بعد رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر انہوں نے شمپین کی بوتل نکال لی، وجہ بظاہر ان دونوں میں سے ایک کی سالگرہ تھی، ایک دھماکے سے بوتل کھولی گئی اور جھاگ کے ساتھ کچھ ام الخبائث بھی چھلک پڑی۔ان دونوں نے مجھے پینے کی دعوت دی اور انکار پر قائل کرنے کی کوشش میں لگ گئیں کہ دیکھو آج تم نے انکار کیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔میں نے اسے میڈیکل سے لیکر مذہب تک بہانہ کیا۔اسے سمجھایا کہ شراب میرے مذہب میں حرام ہے۔مگر برابر والی نشست پر براجمان فربہ گوری خاتون تو ڈٹی رہی، کہنے لگی مگر یہ تو شمپین ہے۔بھلا اس کا کیا گناہ ہوگا؟اسے سمجھایا بی بی ایک قطرہ بھی پینا گناہ ہے۔تو اس سالگرہ والی خاتون نے التجا اور شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا کہ میری آج سالگرہ ہے، میری خاطر تم اتنا سا بھی گناہ سہار نہیں سکتے؟ خیر اسی بحث و تکرار میں کیپ ٹاؤن آگیا۔مگر اس کے علاوہ زندگی میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی کسی نے اس قدر اصرار کیا ہو۔

میں تکنا کا ذکر کر رہا تھا کہ جن دنوں یہ شہر پاکستانیوں سے آباد ہوا کرتا تھا تو ہر چوتھے دن کسی نہ کسی کے گھر دعوت ہوتی تھی، جسے عرف عام میں یہاں ’’فیستا‘‘ کہتے ہیں انگریزی کا لفظ ’’FEAST‘‘ اس کا مناسب متبادل ہے۔بہت خوبصورت ماحول تھا، میرے لیے تو یہ ناسٹلجیا ہی ہے مگر اس شہر کی تاریخ کا ایک خوبصورت باب بھی ہے، جب یہاں پر ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک پاکستانی کمیونٹی کے افراد شہر کی معیشت میں بہت اہم، اور ہر محفل کی رونق ہوا کرتے تھے۔جیسا کہ عرض کیا یہ سب لوگ مالی طور پر انتہائی آسودہ حال تھے۔شہر کے مہنگے ترین مکانوں میں رہائش پذیر تھے، مہنگی گاڑیاں ایک دوسرے سے مقابلے اور ضد میں رکھتے تھے۔خود بھی تقریباً تمام لوگ گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھے۔ریستوران، شاپنگ سنٹر اور شب کدوں میں جان محفل ہوتے تھے۔

شہر سے دس کلومیٹر دوری پر حکومت نے ایک ٹیکس فری زون ’’سٹی کوس‘‘ کے نام سے قائم کر رکھا تھا، یہاں پر انہی پاکستانیوں کا راج تھے، جو تعداد میں ہمیشہ دو تین سو کے قریب ہی تھے مگر سبھی کاروباری حضرات تھے۔گو کہ شہر میں دو پاکستانی ریستوران تھے، مگر زیادہ تر گھروں میں دیسی کھانے بنانے میں خصوصی مہارت رکھنے والی خواتین کام کرتی تھیں۔دور دراز کے گاؤں، گوٹھوں میں دیہاتی خواتین میں اس بات کا چرچا تھا کہ اگر اچھا کام چاہیے تو پاکستانی کھانے بنا نا سیکھ لو، بہت سخی لوگ اور بے پناہ پیسے والے ہیں۔زندگی آسان ہو جائے گی۔

ہمارے گھر میں ماریا کھانا پکاتی تھی، آٹے کی روٹی ایسی گول، نرم اور مزیدار بناتی کہ پاکستان میں بھی کم کم لوگوں کو ہی نصیب ہو پاتی ہے۔اس مرتبہ ایک عرصے کے بعد اسی سٹی کوس میں میرا جانا ہوا۔پرانی جاپانی گاڑیوں پر حکومت نے پابندی عائد کرنے کے سبب یہ سٹی کوس اجڑ گیا ہے۔جہاں ہزاروں لوگ کام کر رہے تھے، اب کل ملا کر سو افراد بھی نہیں ہوں گے۔چاروں جانب ویرانی دیکھ کر دل بہت اداس ہوا۔محسن نقوی کا یہ مصرعہ دماغ میں بہت دیر تک گونجتا رہا

~ اس دشت میں اک شہر تھا، وہ کیا ہوا؟ آوارگی

بہر حال مجھے کسی اجڑے شہر کا نوحہ تو نہیں کہنا، اس نگر کے خوبصورت اور محبت کرنے والے لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔جو آج بھی رنگ نسل، مذہب، زبان کے اختلاف کے باوجود ہم پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔اس شہر کی آباد مسجد اور میرے پاکستانی نژاد جاپانی دوست یاماداعجاز کا انگریزی سکول عہد رفتہ کی یاد دلاتے رہیں گے۔

سفرنامہ

شانزے لیزے پیرس کی سرد شام اور پیگال چرچ

ارشد نذیر ساحل/اسپین

پیرس میں دید سردی اور آسمان پر گہرے سرمئی بادل چھائے ہونے کے باوجود ہمارا قافلہ انقلاب فرانس کی یادگار "ایفل ٹاور" کا نظارہ کرنے کے بعد پیرس کی خوبصورت شاہراہ "شانزے لیزے" پہنچ گیا۔

ہمارے پاس یہاں پیرس میں صرف ایک اور دن باقی تھا اور ابھی پیرس کے بہت سے تاریخی مقامات دیکھنے باقی تھے اور کچھ دوستوں سے ملنا بھی مقصود تھا۔

پیرس کی خوبصورت شاہراہ "شانزے لیزے" دیکھنے کی خواہش تو "پیار کا پہلا شہر" پڑھنے کے بعد ہی ہمارے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ پیرس پہنچ کر شانزے لیزے نہ جائیں بھلا ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔

اس سفر میں ہمارے میزبان بزمِ اہل سخن پیرس کے صدر عاکف غنی، جنرل سیکرٹری ایاز محمود ایاز، سیکرٹری مالیات آصف جاوید آسی، بزم کے سرپرست اعلیٰ شیخ نعمت اللہ اور اٹلی سے آئے مہمان شاعر احمد نصیر ملک ہمارے ساتھ تھے۔ سردی کی شدت کم کرنے کے لیئش انزے لیزے پہنچتے ہی شیخ نعمت اللہ نے ایک معروف بلکہ تاریخی کیفے بار سے ہماری چاکلیٹ کیک اور گرما گرمی کافی سے تواضع کی۔

اس کے بعد ہم شانگزے لیزے کے دلکش مناظر اور دل میں اُترتے لمحوں کو کیمرہ میں محفوظ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ میں تاریخی محراب کی طرف پیدل جاتے ہوئے میں عالی شان عمارتوں، آرٹ کے خوبصورت فن پاروں اور درختوں کے سرخ و زرد پتوں پہ رنگ و نور کی برسات میں کھویا رہا۔

شانزے لیزے پیرس کا فیشن ایبل علاقہ ہے۔ شاہراہ کے دونوں اطراف مشہور کیفے ریسٹورنٹ، لگژری شاپس اور تھیٹرز ہیں اور یہ شاہراہ دنیا کے مشہور برانڈز کی شاپس کی وجہ سے بھی جانی جاتی ہے۔ جبکہ ٹورڈی فرانس ریس کا اختتام اور چودہ جولائی فرانس کی سرکاری پریڈ کا انعقاد بھی یہیں ہوتا ہے۔ شانزے لیزے کی یادگار ایک خاص طرز تعمیر کو ظاہر کرتی بڑی سی محراب ہے جہاں سے تمام پیرس کی طرف سڑکیں نکلتی ہیں۔

جب ہم اس تاریخی محراب کے پاس پہنچے تو سرد ہوا نے ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا مگر ہم نے ان سردی کو خاطر میں لائے بغیر مزے سے سیلفیاں لیں کچھ دیر فیس بک پر لائیو ہوئے اور کافی دیر خوش گپیوں میں بھی مصروف رہے۔

اس موقع پر ایاز محمود ایاز نے بتایا کہ سفارت خانہ پاکستان بالکل شانزے لیزے کی مین سٹریٹ کے پاس ہے اور یہ قیمتی بلڈنگ سفارت خانہ کی اپنی ملکیت ہے۔ جبکہ ادھر سے قطر ایمبیسی کی خوبصورت عمارت بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ صدارتی محل اور اسمبلی ہال بھی اس بارونق شاہراہ پر ہی ہیں۔

رات گئے ہم شانزے لیزے کی خوبصورتی کو آنکھوں اور دل میں سمیٹے گھر کی جانب لوٹے۔ میرا ارادہ تھا کہ گھر پہنچ کر "شانزے لیزے" کی دلکشی پر کچھ لکھوں۔ مگر بقول منیر نیازی:

کچھ باتیں لکھ نہیں پاتا

سردی کی ٹھٹھرتی شاموں کی
برکھا میں برستی سوچوں کی
گرمی میں چمکتی آنکھوں کی
سرخی میں بھڑکتے ہونٹوں کی
عمروں میں بھٹکتی آنکھوں کی

خوشبوؤں کے شہر پیرس میں انقلاب فرانس کی یادگار "ایفل ٹاور" اور دنیا کی خوبصورت ترین سٹرک "شانزے لیزے" کی سیر اور بزمِ اہل سخن کے شاندار مشاعرے کے بعد اگلی صبح میں اور اٹلی سے آئے مہمان شاعر احمد نصیر ملک اپنے میزبان لکھاری دوستوں ایاز محمود ایاز، عاکف غنی اور آصف جاوید اس کے ہمراہ پیگال علاقہ میں واقع مقدس پہاڑی سے ہوتے ہوئے "پیگال چرچ" پہنچے۔

پیگال چرچ دنیا کے قدیم ترین کلیساؤں میں سے ایک ہے۔ جو 1870ء میں مکمل ہوا۔ خوبصورت سفید قیمتی سنگ مرمر سے مزین یہ چرچ 83 میٹر اونچی پہاڑی پر بنایا گیا ہے۔ ہم نیپ لگال چرزچ کی جانب جانے والی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پیرس شہر کو ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے بکھرا ہوا دیکھا۔ یہ منظر میری زندگی کے شاندار مناظر میں سے ایک تھا۔ بلندی سے پیرس شہر کا یہ قابل دید منظر نہ صرف ہم نے اپنی آنکھوں اور دل میں محفوظ کیا بلکہ فیس بک لائیو کے ذریعے اپنے ہزاروں دوست احباب کو بھی دکھایا۔

سگرادھا فاملیا بارسلونا کی طرح پیگال چرچ پیرس میں بھی سارا سال سیاحوں کا رش رہتا ہے۔ جبکہ چرچ کی سیڑھیوں پر دنیا بھر کے ماہر مصور مینٹوں میں سیاحوں کی تصاویر بنانے میں مگن نظر آتے ہیں اور چلتے پھرتے دکاندار ایفل ٹاور پیگال چرچ اور پیرس کی دیگر تاریخی عمارات کے مجسمے، تصاویر اور سوئنر لینڈ فروخت کر رہے ہوتے ہیں۔ پیگال کے اردگرد گلیوں میں سستے بازار، ہوٹلز، ریسٹورنٹ، باریں، موسیقی کے آلات، سووینئرز کی دکانیں اور نائٹ کلب وغیرہ کثیر تعداد میں ہیں۔

انٹرویو: اسد اللہ غالب

ارژنگ : لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ قلمی سفر کے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

اسد اللہ غالب:۔لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا، یہ ایک کھوج لگانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کا سرا بڑا گنجلک ہے۔اور ایک اور ماننے کی بات ہے میرا خیال ہے، جب میں نویں اور دسویں جماعت میں تھا تو اس وقت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کا بہت زیادہ مداح تھا۔ان کی کوئی چیز بھی ملتی تھی تو میں اسے ضرور پڑھتا تھا۔اور ان کے انداز تحریر کو بھی میری خواہش تھی کہ میں اپناؤں۔بہرحال نویں اوردسویں جماعت میں ہی میں نے ''ساربان'' نام سے ایک قلمی میگزین شروع کیا۔اس کا ایک شمارہ بنایا یا دو بنائے۔اس میں ایڈیٹوریل بھی ہوتا تھا، میری نظم بھی ہوتی تھی، میرے ایک دوست کلاس فیلو محمد علی تھے، میرے ساتھی تھے، ان کی بھی ہوتی تھی۔کوئی سیاسی تبصرے بھی ہوتے تھے۔پھر ایک پنجابی میگزین بھی میں نکالا جو شائد اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا اور وہ دیہات میں اور میرے ہی گاؤں میں جو عورتیں لڑتی ہیں ماشاءاللہ۔اور ایک جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔دو شیرنیوں کو لڑتے بھڑتے ہوئے ایک دوسرے کو بڑی کلاسیکل قسم کی گالیاں دیتی ہیں۔اللہ معاف کرے وہ سارا کچھ میں بھی سنتا تھا۔اور پھر اس کو بڑی تفصیل سے اپنے اس پنجابی رسالے میں لکھتا تھا۔یہ سلسلہ باقاعدہ نہیں تھا۔بس ایک ایک دو دو پرچے، وہ بھی نامکمل یہ میں نے میٹرک میں بنائے۔جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آیا توسب سے پہلے جب داخلہ ہو جاتا ہے اور بندہ لائبریری کارڈ بنانے جاتا ہے۔ایک کام یہ بھی ہوتا ہے جیسے ایک شناختی کارڈ بھی بنایا جاتا ہے، یا کالج کا آئی ڈی کارڈ۔لائبریری کارڈ جب میں بنانے گیا تو جو اس وقت راوی شائع ہوا تھا۔جو گورنمنٹ کالج کا میگزین ہے۔محمود شام اس کے ایڈیٹر تھے۔کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھی تھے۔جن کے نام شائد میرے ذہن میں ہوں۔بہرحال محمود شام جو اس کے ایڈیٹر تھے اور قیوم نظر اداراتی بورڈ کے چیئرمین تھے یا نگران تھے تو میں نے سب سے پہلے سب سے اوپر اپنے پن سے اپنا نام لکھا۔چیف ایڈیٹر اسد اللہ غالب۔یہ میرے اندر کا ایک انسان تھا، یہ میرے اندر کا ایک لکھاری تھا، اندر کا ایک صحافی تھا یا ادیب تھا یا ایڈیٹر تھا اور میری ایک عرض تھی کہ میں بھی کبھی اس کے ایڈیٹوریل کا چیف بنوں گا۔اس خواہش کی تکمیل میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔مگر اس سے پہلے تھوڑا سا ایک اور سفر بھی، میں اسلامیہ پارک چوبرجی کے پاس سمن آباد کے درمیان ایک چھوٹی سی آبادی ہے، میں اس میں رہتا تھا۔اور یہیں پر سمن آباد گول چکر کے پاس اردو ڈائجسٹ کا دفتر تھا۔اردو ڈائجسٹ کے ساتھ بچوں کا ڈائجسٹ اور ہفت روزہ ایشیائی ہفت روزہ ایشیا کے ایڈیٹر ملک نصر اللہ خان صاحب تھے۔بزرگ تھے۔ان کے پائے کا اور کوئی ایڈیٹر نہیں تھا اس زمانے میں میرے نزدیک۔یا میں نہیں جانتا تھا۔کہ اتنا بڑا وکیل، علمی لحاظ سے معتبر، تحریر اور اس کی شگفتگی اور اس کی تمہید گی تو میں نے ان کو ایک چھوٹا سا پیراگراف لکھ کے دیا تو بالکل وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کا ایک عکس تھا۔وہ ہفت روزہ تھا تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ اگلے ہی ہفتے وہ جو ایڈیٹوریل جہاں وہ ایڈیٹوریل چھاپتے ہیں اس کے نیچے انہوں نے میری وہ تحریر ایک حاشیے میں اور میرا نام۔اس وقت اسد حجازی میں نے اپنا نام رکھا ہوا تھا۔شاید نسیم حجازی بڑا متاثر تھا۔ناول شاول پڑھ رکھے تھے ان کے۔تو اسد اللہ غالب بہت لمبا نام ہے۔قلمی لحاظ سے اسد حجازی نام استعمال کیا میں نے پہلے پہلے۔اول اول۔تو اس تحریر کے چھپنے سے مجھے بہت حوصلہ ملا۔

ارژنگ : آپ پاکستان کے پہلے War Correspondent ہیں۔جنگ کا آنکھوں دیکھا احوال تحریر کرنے اور رپورٹ کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ اس کی تفصیلات بتانا پسند کریں گے؟

اسد اللہ غالب:۔یہ 1971ء کی جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے۔محسوس یہ ہو رہا تھا کہ بس جنگ شروع ہونے ہی والی ہے۔میرا تعلق چونکہ قصور سے ہے اور ہمارا گھر سرحد سے قریب ہی تھا، اس لئے فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اب جنگ ٹلنے والی نہیں ہے۔میں نے فوج کے تعلقات عامہ سے رابطہ کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جنگ کی براہ راست رپورٹنگ کے لئے مجھے فوج کے ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔میں ان تفصیلات میں نہیں جاتا جو میں نے اپنی جان بھی جوکھوں میں ڈالی، اور اس ٹریک پہ

میں نے سفر کیا میدان جنگ میں جہاں جہاں سے وہ رات کو گزرے۔لیکن میں تو دن میں گزرتا تھا۔لیکن وہ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا۔تو وہ میں نے اس طرح اپنے مشاہدات ،جب جو فیچر تھا وہ میں نے اردو ڈائجسٹ احسان چھ قسطوں میں لکھا۔پھر الطاف صاحب بھی کہنے لگے کہ بھئی یہ تو بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے۔آپ اس پر کتاب لکھ دیں تو بعد میں میں نے انہی کو تھوڑا سا پھیلا کے جو میری پہلی کتاب ہے"قلم کی آنکھ سے"۔وہ میری کتاب چھپی ہوئی تھی اسی جنگ کے بارے میں مبنی تھی اس کے اوپر قلم کی آنکھ سے۔اور اس کی ہم نے جو تقریب رونمائی ہے وہ قصور پریس کلب میں کی۔جس میں اداکار محمد علی، سینیٹر میاں احسان الحق جو بعد میں وزیر اطلاعات بھی بنے پنجاب کے،یا شائد اس وقت بھی تھے،اس میں انوشہ رحمان بھی شامل ہوئیں،اس میں نسیم حجازی بھی تھے،حفیظ جالندھری بھی تھے،مجیب شامی بھی تھے،قصور کے کچھ مقامی لوگ بھی تھے،انہوں نے بھی تقریریں کیں،بڑی اچھی تقریریں کیں،ایک صاحب نے تو پنجابی میں کی اور کمال ہی کر دیا۔میں نے ان کا مقالہ بڑی دیر محفوظ رکھا۔لیکن بھائی لاہور میں کوئی بیس،بائیس رہائشیں بدلی ہیں۔اب پتہ نہیں کہاں نظر ہو گیا،لیکن وہ بہت ہی عظیم تحریر تھی۔جو پنجابی کی تھی،ایسی شستہ پنجابی میں اور کیا کہتے ہیں نواں پنجابی محاورے انہوں نے فٹ کئے کہ لوگ عش عش کر اٹھے تھے،اور اس کی تقریب رونمائی اس ہم نے قصور پریس کلب میں کی تھی۔

ارژنگ: صحافت کی طرف کب اور کیسے آئے؟ اس سفر کے پیچ و خم بارے بتایئے؟

اسد اللہ غالب:۔صحافت کے سفر میں تھوڑی سی بریک آئی ،کیونکہ اردو ڈائجسٹ اور جو ہفت روزہ زندگی تھا،بھٹو صاحب کا عتاب کا نشانہ بنا،جیسے ہی انہوں نے 1971 میں اقتدار سنبھالا۔انہوں نے ڈاکٹر اعجاز اسلم قریشی،ڈاکٹر الطاف اسلم قریشی اور مجیب الرحمان شامی کو گرفتار کر لیا۔اور ایک مختصر سا فوجی ٹرائل ہوا،اس میں ایک میجر صاحب تھے یا کیپٹن صاحب تھے،وہ نہ کوئی بات کرتے تھے اور نہ سنتے تھے۔بس ایک دن انہوں نے بلا کر سزا سنا دی،لاکھوں کا جرمانہ اور بڑی لمبی قید کی سزا۔دوسری طرف انہوں نے پنجاب کا ایک پنچ رسالہ تھا،مظفر قادر تھے جو شاید مالک تھے اور حسین نقی اس کے ایڈیٹر تھے،ان کو بھی دائیں اور بائیں یعنی بھٹو صاحب نے دو بڑے اخباری گروپوں پر ہاتھ ڈالا۔اس طرح جو ہمارا ادارہ تھا وہ بحران کا شکار ہو گیا۔بعض اوقات کبھی تنخواہ ملتی تھی،کبھی نہیں بھی ملتی تھی۔ایک دو سال کے لئے لیکچرار شپ کر لی،گوجرانوالہ میں رہا اور پھر ڈسکہ میں رہا،مگر یہ مجھے راس نہیں آئی۔میں واپس پھر ان کے پاس آ گیا۔اس وقت شامی صاحب ان کو خیر باد کہہ چکے تھے۔میں زندگی کا دو برس تک ایڈیٹر بھی رہا۔

ارژنگ:۔آپ روزنامہ نوائے وقت کے طویل عرصہ تک مدیر رہے،پھر جنگ کی بھی ادارت کی،یہ تجربہ کیسا رہا؟

اسد اللہ غالب:یہ 1980 کی بات ہے کہ مجھے کسی نے کہا کہ نوائے وقت والوں کو ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔یہ ضرورت بھی اس لئے پڑی کہ جنگ اس وقت لاہور میں اپنی اشاعت کا آغاز کر چکا تھا۔اور وہ نوائے وقت کے ہی قدرت اللہ چوہدری اور قیوم احسانی ان سے علیحدہ کروا کے یہ جنگ میگزین ایڈیٹر بن گئے تھے۔تو ادھر ان کا خیال ہوگا کہ شائد اسی طرح کا کوئی بندہ آئے مگر جب میں وہاں گیا تو وہاں ضیاء [illegible] شاہد بھی تھے۔اور عبدالقادر حسن بھی۔انہوں نے کہا کہ میگزین ایڈیٹر میں ہوں۔لیکن بہرحال میں اسے بڑی محنت سے چلایا۔یہ جو دو اخباروں کا مقابلہ تھا۔اس میں جو نوائے وقت تھا اس میں تن کے کھڑا رہا اس مقابلے میں،جنگ کے مقابلے میں ان سے زیادہ چیزیں ہم نے دیں،ان سے زیادہ دلکشی ہم نے پیدا کی،مواد میں بھی،پیشکش میں بھی،بڑی محنت کی میں نے اور اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ مجھے سب ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر کے طور پر رکھا جاتا ،مجھے انہوں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر رکھا۔حالانکہ مجید نظامی صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم کسی کو ایڈیٹر رکھتے نہیں لیکن ہم آپ کو سب سے بڑا عہدہ سب ایڈیٹر کا دے دیتے ہیں۔تو اس اعتبار سے میں دو تین برس تک نوائے وقت کے میگزین کا ایڈیٹر رہا۔وہاں سے پھر شکیل الرحمان مجھے اپنے اخبار میں لے گئے۔کیونکہ ان کے اخبار کا جو میگزین تھا وہ کمزور پڑا ہوا تھا۔انہوں نے مجھے وہاں پھسا دیا۔وہاں پھر ایک جھگڑا تھا،کچھ سازشیں تھیں،وہاں سے بھاگا اور مجید نظامی صاحب کے پاس پہنچا،ان کے پاس دفتر بالکل خالی پڑا تھا۔تو یہ بھی خالی ہاتھ،انہوں نے کہا ٹھیک ہے بھئی،آپ آ جائیں مگر تنخواہ وہی ملے گی جو آپ چھوڑ کر گئے ہیں ،وہ نہیں دیں گے جو شکیل الرحمان نے دی تھی۔میں نے کہا آپ کام تو دیں۔اس طرح واپس نوائے وقت

میں آ گیا۔مگر اسی سال میں جو نوائے وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔بشیر احمد ارشد صاحب۔تو مجید نظامی صاحب نے ایک نیا تجربہ کیا۔ایک میگزین ایڈیٹر کو ہی انہوں نے ڈپٹی ایڈیٹر کے عہدے پر ترقی دے دی۔اور میں نوائے وقت کا اداریہ نویس بن گیا۔اگلے گیارہ سال کے لئے، جی۔اور یہ ایک ایسا تجربہ ہے کہ جس نے، میں ایسے تو نہیں کہوں گا کہ اس نے مجھے سائیکل کیا۔وہ تو جو میری تربیت گاہ تھی وہ اردو ڈائجسٹ ہی تھا ادارہ اس کا۔وہاں جو محنت کی گئی ہے ہاں محنت ہی میں کہوں گا۔مشقت تو نہیں کہوں گا۔وجہ یہ تھی کہ اس وقت کوئی ڈنڈا لے کے کام نئی کراتا تھا۔تو اصل جو میری تربیت ہے وہ اردو ڈائجسٹ کے ادارے میں ہی ہوئی۔اس کا ثمر جو ہے یا اس کے جواہر جو ہیں وہ نوائے وقت میں آ کر کھلے۔مگر یہاں اداریہ نویس کی حیثیت سے جو سیاسی رموز ہیں، جو پیچ و خم ہیں، حکومتی راہداریوں کے ،عالمی معاملات کا مطالعہ کرنے میں اور ان کو سمجھنے کا جو تجربہ ہے وہ مجھے حاصل ہوا، نوائے وقت میں 1996 میں جس روز شوکت خانم میں دھماکہ ہوا اسپتال میں۔اس روز کوئی اختلاف ہوا میرا اور نظامی صاحب کا، اور انہوں نے چند سیکنڈ کے اندر ہی مجھے فیصلہ کرنے کا حکم دیا، میں نے کہا ٹھیک ہے ،آپ مجھے چائے پلائیں میں آپ کا مہمان ہوں تو انہیں نہیں سمجھ آئی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، وہاں سے اٹھے میں نے اپنا داریہ لکھا ہوا تھا ظاہر ہے وہ سب شوکت خانم کے اوپر ہی لکھنا تھا، اس وقت یہ سب سے پہلی کسی اسپتال میں تباہی تھی۔خاص طور پر نواز شریف اور شہباز شریف کی حکومت تھی یا شاید انہی کی تھی اور شہباز شریف وزیر اعلیٰ تھے، اور نواز شریف صاحب وزیر اعظم تھے۔تو اس پہ میں نے اداریہ لکھا۔اور اداریہ لکھنے کے بعد میں نے شکیل الرحمان صاحب کو فون کیا۔میں نے کہا کہ ج مجھے یہاں سے تو تنگ کر کے نکلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی میں پہلے غلطی کی تھی آپ کو نکالنے میں تو اس کا ازالہ ہو جائے گا۔آپ کوئی کالم لکھیں اور میرے پی اے کو دے آئیں۔آج تو وقت گزر گیا اور ہمارا آج کا اخبار بھی بن گیا ہے۔ایڈیٹوریل کا صفحہ ،کل آپ کا لگا دیں گے اور پرسوں جو اخبار چھپے گا اس کے اشتہار میں اعلان بھی ہوگا اور آپ کا کالم بھی چھپے گا اور یوں میں پھر ان کے جنگ کے ادارے میں واپس چلا گیا۔اس مرتبہ ایڈیٹوریل کا چیئرمین ہوتا ہے وہ میں تھا اور جو جنگ کا ایڈیٹوریل کا بورڈ ہے او وہ لاہور سے ہی کام کرتا ہے، ان کا مرکز لاہور میں ہے اگرچہ کراچی میں بھی ایک آدمی انہوں نے رکھا ہوتا ہے۔ایک دو آدمی رکھے ہوتے ہیں۔لیکن لاہور والے جو ہیں وہ لاہور، پنڈی کا اخبار بناتے ہیں۔جو بھی بناتے ہیں وہ یہیں بنتا ہے۔کراچی والے اپنی تھوڑی سی تحریریں کراچی والوں کے ذوق کے پیش نظر الگ بناتے تھے۔مگر جو مین پالیسی اور اس کا اداریہ جو ہے وہ لاہور ہی سے کنٹرول ہوتا تھا۔اس حیثیت سے چھ سات برس میں نے پھر جنگ میں گزارے ہیں۔

ارژنگ :۔آپ کو پاکستانی صحافت میں ''ریموٹ اخبار'' کا بانی اور موجد کہا مانا جاتا ہے، اس تجربے کے بارے میں کچھ بتائیے؟

اسد اللہ غالب:۔جنگ میں ہوتے ہوئے مجھے امریکی سینٹر جسے US,IS کہا جاتا ہے، محکمہ اطلاعات ہوتا ہے ان کا، تو قونصل جنرل کے ماتحت لاہور میں تو انہوں نے مجھے ایک مطالعاتی دورے پر امریکہ بھیجا۔گیارہ دن کے لئے۔لیکن جو میرا ویزہ تھا وہ ان لیمیٹڈ کا تھا۔تو میں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور میرے ذہن میں ایک سکیم تھی کہ کوئی اردو کا ایسا اخبار بنایا جائے کہ جو بنے تو لاہور لیکن چھپے کسی دوسرے ملک میں۔تو اس مقصد کے لئے میں دو، تین ماہ میں لوگو سے ملتا جلتا رہا۔بالآخر مجھے ایک ٹیم میسر آ گئی۔ میں اپریل میں گیا تھا اور اگست میں واپس آیا۔چودہ اگست کے قریب لگ بھگ واپس آ کر ہم پہلا ریموٹ اخبار یعنی بنے کسی اور جگہ اور چھپے کسی اور جگہ سے۔یہ اردو صحافت کا پہلا تجربہ تھا کہ اخبار پاکستان میں بنے اور وہ مکمل پیج میکنگ ہو کے اس کی PDF کی شکل میں یا پھر جس مرضی شکل میں کسی دوسرے ملک یا نیو یارک کے پریس میں جائے۔نیویارک میں جو پریس نیجر تھا مسٹر لنک، یا لنکو پریس تھا اس کا۔ایک چینی نیجر تھا۔اس نے کہا تھا مسٹر غالب'' write Just Iianddear&datenumber,pagedown Urdurecognisewill Iandonlyseewill pagepapertheplacewill Isolanguage 32, 1, number...... ''یہ سولہ صفحوں کا اخبار تھا۔کیوں کہ اس نے کہا کہ آپ رات کو یہ بھیجیں گے تو اگلے دن میں یہ چھاپ کے اس کا بنڈل باہر رکھ دوں گا جو بندہ آئے گا، پیسے دے گا وہ اٹھا کے لے جائے گا۔اس طرح ہم نے یہ اخبار اور سیز ملت کے نام سے میری ملت ڈاٹ کام پہلے سے چل رہی تھی۔او ورسیز کے نام سے ہم نے پہلا ایک کامیاب تجربہ

کیا۔ جیسے Learnig Distance ہوتی ہے، کہ لیکچر دینے والا کہیں بیٹھا ہے اور لیکچر سننے والے کہیں بیٹھے ہیں، Publishing Distance آپ اسے کہہ سکتے ہیں کہ بنے کسی اور جگہ اور چھپے کہیں اور سے۔ اردو صحافت میں یہ پہلا تجربہ تھا اس وقت اور پبلشنگ کا بھی۔ یہ مجھے خیال آیا تھا یو ایس اے ٹوڈے کو دیکھ کر۔ وہ اخبار جو تھا وہ امریکہ کے بھی کئی شہروں میں چھپتا تھا۔ ہانگ کانگ یا سنگاپور سے بھی چھپتا تھا۔ تو میں نے کہا اگر انگریزی کا اخبار جا سکتا ہے تو اردو کا اخبار بھی جا سکتا ہے۔ وہ بعد کی بات ہے کہ اردو کے اخبار کو بیچنے میں مشکلات کتنی پیش آئیں۔ وہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہرحال لیکن اللہ کا شکر ہے کہ 14 اگست 2000 کو ہم نے پہلا تجربہ کیا۔ جب تاریخ لکھی جائے گی تو یہ بنیاد بنے گی اس تجربے کی جس پر آج اردو صحافت آب و تاب دکھا رہی ہے۔ جو بھی اخبار ہے، وہ رحمت علی رازی کا ہو، جنگ ہو، نوائے وقت ہو، وفاق ہو، تجارت ہو، ایکسپریس ہو تو دس دس بارہ بارہ صفحوں کا کئی کئی ملکوں میں چھپتے ہیں، بنتے وہ ایک جگہ پہ ہیں۔ جب میں نے یہ وہاں سے نکالا تو اس وقت ایکسپریس تھا وہ اپنی اشاعت کا اعلان کر چکا تھا۔ اور یہ بھی اعلان کر چکا تھا کہ وہ بیک وقت کئی شہروں سے چھپے گا کسی کو انہوں نے جنگ سے لے کے ایڈیٹر بھی بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک سال سے وہ صاحب تنخواہ لئے جا رہے تھے ان کو معلوم نہیں تھا کہ اخبار بنا کر دوسری جگہ بھیجنا کیسے ہے۔ حالانکہ یہ جو ایکسپریس لیکسن ٹیکو کمپنی والے ہیں ان کی اپنی ایک انٹرنیٹ کی کمپنی ہے۔ ان کے لئے تو بہت آسانی ہونی چاہیئے۔ جو انجینئر تھے وہ ان کو بنا سکتے تھے کہ آپ اخبار بنائیں ایک جگہ، ہم دوسری جگہ منتقل کر دیں گے جہاں آپ کہیں گے۔ ان کے ذہن میں یہ نسخہ کیسا نہیں آیا۔ پھر وہ جو ایڈیٹر بنے ہوئے تھے وہ میرے پاس آئے اور پھر مجھ سے انہوں نے سمجھا۔ پھر بھی انہوں نہیں نکالا، پھر بھی نہیں کر سکے۔ اتنی دیر میں ضیاء شاہد صاحب میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی جو آپ نے وہاں تجربہ کیا تھا وہ بند ہو گیا۔ جو آپ نے تجربہ کرنا ہے وہ آپ میرے اخبار میں کر لیں۔ میں اخبار چار پانچ جگہ سے نکالتا ہوں۔ دو تین سو بندے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے لاہور کو پروڈکشن یعنی ایڈیٹوریل مرکز کے طور پہ بنا دیں اور ملتان سے، اسلام آباد سے، پشاور سے، مظفر آباد سے کراچی میں وہ بنا بنایا اخبار منتقل ہو جائے۔ تو پاکستان میں اردو کے اخبار وں میں خبریں وہ پہلا پرچہ تھا۔ جس نے پروڈکشن ہاؤس یعنی ایڈیٹوریل مرکز تو لاہور ہی کو رکھا۔ یہاں سے رات کو ڈھائی بجے فنشڈ اخبار جو دیگر مراکز ہیں جیسے لاہور، اسلام آباد، پشاور، کراچی، ملتان وہاں کے پرنٹنگ پریسز میں پہنچ جاتا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ وہاں جو دو دو سو بندے تھے ان کو فارغ کرنا پڑا۔ پرنٹنگ میں جو کام دے سکتے تھے ان کو رکھا باقی سب کو فارغ کر دیا گیا۔ پھر مجھے خبریں سے بڑی جلدی نوکری سے نکال دیا گیا۔ یہ تجربہ ان کا میں نے مکمل کر دیا تھا۔ یہ ایک نہیں سب نے اسی تجربے کو اپنایا اور آج بھی بڑا حیران کرتے ہیں کہ بارہ شہروں سے چھپ رہے ہیں، تین ملکوں سے چھپ رہے ہیں۔ لیکن جو میرا اوریجنل منصوبہ تھا وہ میں جنگ کی ملازمت کے دوران روزانہ کی بنیاد پر جس کی میٹنگ کرتے تھے۔ وہ میرا منصوبہ یہ تھا کہ ایک چار صفحوں پر مشتمل اخبار ہو، بلیک اینڈ وائیٹ ہو اور وہ ہر ضلع سے مارننگ پیپر کے طور پہ چھپے اور جتنے بھی اخبار ہوں کراچی کے ہوں یا اسلام آباد کے ہوں یا لاہور کے ہوں۔ وہ صبح کی ڈاک نمبر ایک دو تین، لیکن جو لوکل اخبار ہوتے ہیں وہ صرف لاہور کے لئے ہی رہ جاتے ہیں، تو دور دراز کے لوگوں کو تیسرے دن کی خبریں پڑھنی پڑتی تھیں۔ پچھلے دن کی بھی نہیں تو پھر وہ رائٹر سے ترجمہ کر کے یا اے ایف پی سے، ویت نام کے، لاؤڈ یا سے یہ خبریں پڑھنی پڑتی تھیں، ایک دفعہ میں نے نظامی صاحب سے کہا بھی کہ میاں والی کے لوگ، جھنگ کے لوگ، وہ سی ایس پی کئے ہوئے ہیں اور ان کو عالمی معلومات بڑی ضروری ہیں ہمیں وہاں اپنا یہ ایڈیشن بھیجنا چاہیئے۔ بہرحال اس وقت نہ میرے ذہن میں کوئی ترتیب تھی اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا کہ اس پر کچھ سوچیں۔ میرے منصوبے کی بھنک شکیل الرحمان کے کان میں پڑ گئی تھی۔ جب میں یہ میٹنگیں کرتا تھا تو انہوں نے مجھے ضرور کہا تھا کہ آپ کا جو تجربہ جس کی آپ روزا واری میں میٹنگ کرتے ہیں، مجھے ان کی خبر مل جاتی ہے۔ تو آپ یہ تجربہ جنگ میں کریں۔ میں نے کہا کہ جنگ میں تو میں آپ کا ایڈیٹر ہوں۔ میں آپ کا کوئی پراجیکٹ ڈائریکٹر نہیں ہوں یا آپ مجھے پراجیکٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دیں۔ تنخواہ دیں پانچ لاکھ روپے یا پھر میرے ساتھ ایک معاہدہ کریں ورنہ پچاس لاکھ روپے مجھے دیں اور مجھے ایک ٹائم فریم دے دیں۔ اس ٹائم فریم کے اندر میں آپ کو اس وقت انہوں نے اعلان کیا ہوا تھا ملتان اور پشاور

کوشامل کرنے کا کہ وہاں سے۔ جب انہوں نے میرے منہ سے بڑی بڑی رقمیں سنی تو انہوں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے میں تمہارے دماغ میں ایک چپ لگا دی ہے۔ تم جو بھی پلان کرو گے وہ پلان خود بخود ہی میرے ذہن میں آ جایا کرے گا وہ میں خود ہی کر لیا کروں گا۔ وہ بھری مجلس تھی میں نے کہا کہ شکیل صاحب اگلے سال چھ

کر کے پیسے کماتے تھے۔ ان کے لئے اس میں کوئی نئی معلومات نہیں بلکہ تین دن پرانی خبریں ہوتی تھیں۔ ایک تو پہلے ہی اخبار میں پرانی خبریں، جو ڈاک ایڈیشن ہوتا ہے۔ اس میں تین دن پرانی خبریں ہوتی تھیں۔ یعنی جو دھماکہ آج صبح لاہور میں ہوگا تو دھماکے کی خبر تیسرے دن دور دراز کے علاقے میں ہم پہنچائیں گے۔ کیا کمال ہے۔ میں تو

(چھیانوے، ستانوے، اٹھانوے، ننانوے، دو ہزار) میں اسے صحافت نہیں سمجھتا۔ سو خبر کو دور دراز تک پہنچانے

فیصل آباد اور ملتان میں موجودہ نظام کے تحت بھی اخبار شروع کر لیں۔ جس میں میرے والا کلیہ اپلائی نہیں ہوتا شروع کر لیں تو میں صحافت چھوڑ دوں گا۔ تو بھائی فی ؟ صل آباد سے تو آج تک نہیں نکلا۔ پچیس سال ہو گئے ہیں اسکو۔ ملتان سے نکلا وہ بھی 2002 میں اور بڑا ماٹھا سا اخبار۔ یہ وہیں بنتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی لاہور سے بن کے جاتا تھا۔ یہ ہے میرا صحافتی تجربہ۔ یہ وہی تھا جس کے پیچھے ملت ڈاٹ کام والی سوچ تھی۔

ارژنگ:۔ ملت ڈاٹ کام اردو کی پہلی اخباری ویب سائیٹ ہے۔ آن لائین اخبار کے اجراء کے محرکات کیا تھے؟ یہ تجربہ کیسا رہا؟

اسد اللہ غالب:۔ اب یہ جو صحافت کی پبلشنگ کا یہ نیا تجربہ ہے کہ آپ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں بھی وہی خبر دیں جو آپ لاہور کے گلبرگ کو دیتے ہیں یا ڈیفنس کو دیتے ہیں موچی دروازے کو دیتے ہیں۔ اس کے ارد گرد رہنے والوں کو دیتے ہیں۔ آپ کو دور دراز کے علاقے کو لوگوں کو جاہل رکھنے کا حق کس نے دیا۔ آپ اس کو صحافت کہتے ہیں نہیں بھائی، یہ ردی کا ایک ڈھیر ہے۔ یہ ان لوگوں کو فروخت کا ایک وسیلہ میرا جو بیرونی سفر ہے ان کی وجہ سے میرے ذہن میں ہے میں نے دیکھا کہ پہلے جو زیادہ تر میرے ٹورز ہیں تفصیلی ٹورز ہیں وہ برطانیہ کے تھے تو وہاں جنگ اخبار ضرور چھپتا تھا۔ یہ بھی اسی طرح کا اخبار تھا، جیسے یہاں کے ڈاک ایڈیشن تھے۔ ان میں بھی تازہ خبر نہیں ہوتی تھے جنگ میں بھی۔ تو میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ میں ایک ویب سائیٹ لانچ کروں۔ جس پر ہر تازہ خبر موجود ہو۔ ہر تازہ تصویر موجود ہو۔ ہر تازہ ویڈیو موجود ہو۔ ہر تازہ کتاب موجود ہو۔ ایک لحاظ سے ایک مکمل معلومات کے مرکز کے طور پر اسے میں نے لانچ کیا۔ تو سب سے پہلے 1997 میں میں نے غیر رسمی طور پر اور 1998 میں اپریل سے ملت کے نام سے ملت ڈاٹ کام کے نام سے رجسٹر کی۔ اور تب سے لے کر آج تک کتنے سال ہو گئے۔ بیس سال یہ اور تین سال وہ بھی تئیس سال ہو گئے ہیں تو یہ سلسلہ جاری ہے۔ تو میرے ذہن میں بھی یہ تھا کہ یہ جو ہمارے پاکستانی بھائی ہیں۔ وہ اپنے ملک کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کہ کس وقت کیا ہوا۔ یہ نہیں کہ جو ہو گیا وہ کب ہوا تھا۔ جس وقت ہو رہا ہے۔ انہیں اسی وقت پتہ چلنا چاہیئے۔ جو Latest ہے وہ معلومات جاننے کا ان کو بنیادی حق ہے۔ جو معلومات فراہم کر رہا ہے۔ میری عرض یہ ہے کہ وہ Latest مال بیچیں۔ اپنا پرانا ردی مال نکال کر نہ بیچیں۔ تو میں نے ملت ڈاٹ کام کا جو اجراء کیا۔ اس کے ذریعے جو دور دراز علاقوں تک بلکہ پوری دنیا تک جو خبریں ہیں پہنچتی تھیں۔ اس تجربے نے مجھے یہ سکھایا کہ کم از کم پاکستان کے اردو اخبار کو اس نہج پر لاؤں کہ اس راستے پہ لاؤں جس وہ اپنے قارئین کو تازہ ترین خبریں فراہم کر سکیں۔

ارژنگ:۔ زمانہ طالب علمی سے آپ ادارت کے شعبے سے وابستہ ہیں، طویل عرصہ بطور ایڈیٹر کام کرنا کیسا لگا؟ اس بارے میں کچھ یادیں شیئر کریں گے؟

اسد اللہ غالب:۔ ایک ایڈیٹر کے طور پہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے آج کہ میرے تجربے کا اور اتنی کم عمر کا آدمی۔ میں بہتر سال کا ہوں آج، پاکستان میں 90 کو پہنچنے والے اخبار نویس بھی موجود ہیں، اچھا لکھنے والے بھی ہیں۔ لیکن میرا یہ منفرد اعزاز ہے کہ میرے اپنے زمانے کے جو دو بڑے اخبار تھے، جنگ اور نوائے وقت ان دونوں کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ اور میری ایڈیٹری کے دوران مجھے جن سے واسطہ رہا، یا جن سے میرا ورکنگ ریلیشن شپ قائم ہوئی۔ جن کا میں ایڈیٹر رہا۔ پاکستان کے نامی گرامی کالم نویس اور تجزیہ کار شامل تھے۔ ارشاد احمد حقانی، وہ کالج میں میرے پروفیسر تھے۔ میرے استاد تھے۔ لیکن جنگ میں ایڈیٹر میں تھا اور وہ میرے کالم نویس تھے۔ عبدالقادر حسن آج بیاسی، چھیاسی برس کے ہو گئے ہیں۔ میں ان کا بھی ایڈیٹر تھا۔ منو بھائی اللہ کو

پیارے ہو گئے۔ بہت اچھا لکھتے تھے۔ میں ان کا بھی ایڈیٹر تھا۔ نئے آنے والے جاوید چوہدری ہیں، حامد میر ہیں۔ پرانے لکھنے والے عطاء الحق قاسمی ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود ہیں۔ مجیب الرحمان شامی ہیں۔ پاکستان کا کوئی بھی لکھنے والا ہو جو اس وقت جنگ یا نوائے وقت میں لکھتا ہو تو میں بھائی ان کا ایڈیٹر تھا۔ میرے حق ایڈیٹری کو چیلنج کرنے والے بہت تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے اپنے ایڈیٹری کے فرائض کس طرح انجام دینے ہیں۔ اس کی میں ایک مثال دوں گا۔ ایک مرتبہ ہارون رشید نے بحریہ ٹاؤن کے اوپر کالم لکھ کے بھیج دیا۔ کالم بہت خوبصورت تھا۔ انداز بیان کے سبب ہم تو ان کو استاد ہارون کہتے ہیں، انداز بیاں ادیبانہ، رواں دواں، شاعرانہ وہ تو ایک کھلا اشتہار تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ وہ ساری رات میرا سر کھاتے رہے کہ اسے چھاپو، اسے چھاپو، میں نے کہا بھی آپ اسے چھپوا لیں، صفحہ اول پہ چھپوا لیں۔ اپنے لوگو کے ساتھ چھپوا لیں۔ لیکن نیچے اشتہار لکھا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ میں شکیل الرحمان سے بات کرتا ہوں، میں نے کہا کہ ضرور کریں۔ وہ مالک ہیں۔ وہ کہیں گے تو چھپ جائے گا۔ لیکن اگر وہ کہیں گے کہ اسے بطور کالم چھاپو تو میں انکار کر دوں گا۔ کیونکہ کہ یہ کالم نہیں ہے۔ یہ اشتہار ہے۔ اور میں شعبہ اشتہار کو مارک کر دوں گا۔ یہ اشتہار میں شمار ہوتا ہے۔ وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ شکیل الرحمان صاحب کے پی اے نے کہا کہ صاحب کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ میں بات کر لیتا ہوں تم کون ہوتے ہو؟ میرے پاس آج بھی کہیں کاغذات میں ان کی تحریر پڑی ہوگی۔ میں نے ان کا کالم نہیں چھاپا۔ جاوید چوہدری صاحب کے اکثر کالم میں روکتا تھا۔ اور وہ جھگڑا کرتے تھے کہ یہ کیوں روکے۔ میں نے کہا کہ آپ نے جو کہانی لکھی ہے کہ وہ آئن سٹائن تھا۔ وہ پیدا ہوا۔ اس کو کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ وہ اٹھتا تھا۔ بیٹھ جاتا تھا۔ وہ لڑکھڑا جاتا تھا۔ میں نے کہا کہ کہانی اچھی ہے۔ لیکن جو اس کا آخری پیرا گراف آپ نے لکھا ہے، میں اس کو نہیں چھاپ سکتا۔ کہانی یہی رہے گی لیکن آپ اس کا نتیجہ دوسرا نکال لیں۔ تو چھپ جائے گا۔ وہ بھی سر پٹختے رہے۔ لیکن میں تو ایڈیٹر تھا۔ اور اگر بندہ ایڈیٹر ہو تو وہ ایڈیٹر ہی ہوتا ہے۔ اگر بندہ جنگ کا سپہ سالار ہے تو وہی سپہ سالار ہے۔ اگر کوئی بندہ کسی ملک کا وزیراعظم ہو تو وہی وزیراعظم ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرنا نہ جانتا ہو یا اپنے فرائض منصبی کو نہ جانتا ہو۔ تو اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں جتنے بھی کالم نویس ہیں میں ان کی دائی ہوں۔ جو بچے پیدا کرتی ہے۔ میں نے کئی نئے کالم نویس پیدا کئے ہیں۔ مجیب الرحمان شامی بھی ان میں شامل ہیں۔ اور صابر اعوان بھی ان میں شامل ہیں۔ سہیل وڑائچ بھی میرے پاس آئے کہ میں کالم لکھنا چاہتا ہوں اور سفارش لے کے آئے۔ میں نے کہا آپ ضرور لکھیں، چھاپیں گے۔ انہوں نے ایک کالم لکھا لیکن وہ کالم نہیں تھا۔ پھر انہوں نے نہیں لکھا۔ کئی برس تک نہیں لکھا۔ اب بھی لکھتے ہیں تو اگر شائد اس میں کوئی سیاسی بات ہو تو سیاسی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں جو کالمانہ بنت ہوتی ہے وہ اس میں نہیں ہوتی۔ اور شائد آج بھی نہیں ہوتی۔ افتخار فتنہ بھی میرے پاس آئے، وہ خود ہی آئے، کسی کے ذریعے نہیں آئے۔ کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ میری تصویر چھپے۔ میں نے کہا کہ تصویر چھپ سکتی ہے لیکن آپ کالم لکھیں۔ کہنے لگے کہ وہ تو مجھ سے نہیں لکھا جاتا، آپ کسی اور سے کہیں کہ لکھ دے۔ میں نے کہا کہ آپ کے نام پہ کون لکھے گا؟ ملیحہ لودھی نے کہا مجھ سے فون کر کے کہ میں ڈیلی میل میں لکھتی ہوں۔ اس کو ہزار پانچ سو بندہ پڑھتا ہے۔ آپ کے کالم کو لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں، اردو میں کالم کو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میرا کالم اردو میں چھپ جائے؟ میں نے کہا کہ چھپ جائے گا آپ مجھے پیسے دے دیں۔ کوئی ترجمہ کر دے گا اور چھپ جائے گا۔ انہوں نے پیسے دیئے اور میں کسی سے ترجمہ کروا کے چھاپتا تھا۔ شفیق مرزا ساتھ تھے، ایڈیٹوریل بورڈ میں۔ اللہ جنت نصیب کرے ان کو۔ وہ فوت ہو گئے تھے۔ نیچے سڑک پہ پڑے فوت ہو گئے ہیں۔ اسی دوران ان کے اوپر سے دو تین موٹر سائیکل بھی گزر گئے۔ ان کے بازو اور ٹانگیں بھی توڑ دی شائد۔ اللہ کو جیسے منظور تھا۔ لیکن وہ بہت صاحب کالم بھی تھا۔ اور بڑے باوقار بھی تھے۔ ہنس مکھ بھی تھے۔ تو انہوں نے تعاون کیا اور چھاپتے تھے۔ اور بی بی ان کو کوئی پیسے بھی دیتی تھی یا نہیں دیتی تھی۔ میں نے تو ان کو یہی کہا تھا کہ یہ آدمی ترجمہ کر دے گا۔ اور آدمی بھی تھے۔ بشیر دوسوال بھی تھے، ساہیوال میں رہتے تھے۔ ممبر بورڈ بھی تھے، اور پھر ظفر اقبال صاحب، جب میں زندگی کا ایڈیٹر تھا، وہ وہاں لکھتے تھے۔ نوائے وقت میں آیا تب وہاں چھپتے تھے، جب میں جنگ میں آیا، تب وہاں آ گئے۔ بعض کالم ایسے بھی ہوتے تھے جو وہ کہتے تھے کہ نئے ہیں۔ میں کہتا تھا ظفر صاحب یہ فلاں سن فلاں ہفتے زندگی میں چھپے تھے۔ مجھے پرانے سب چھپے ہوئے کالم یاد ہیں۔ اس طرح بھائی میں تو صحافیوں کی دائی ہوں۔ اور آیا بھی ہوں جس نے ان کی پرورش

بھی کی۔ان کو پیدا کیا۔اوران جوان کا مناسب مقام ہونا چاہیے ۔وہ دیا ان کو۔جیسے ماں باپ اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو مناسب مقام دیتے ہیں۔اس طرح ان کو مناسب مقام بھی دیا۔اب شامی صاحب کا آپ ملاحظہ کریں جب جب حادثہ ہوا بہاولپور کا 1988 میں۔انہوں نے فوراً اس پر کالم لکھ بھیجا اسی شام۔وردی میں شہادت۔اب اصولی طور پر ان کا جو کالم تھا۔وہ ہمارے ایڈیٹوریل پیج پر چھپتا تھا۔آج جو آئے گا وہ کتابت ہو جائے گا۔صفحہ بن جائے گا۔وہ صفحہ اگلے دن سارے سٹیشنوں کو بھیجیں گے۔وہ اپنے طور پر اس کی کتابت کرتے تھے۔پھر اسی ترتیب سے وہ اس کی کتابت کر لیتے تھے۔بطور ایڈیٹر یہ میرا فیصلہ تھا کہ یہ ایک تازہ ترین واقعہ تھا۔اس کو اگلے دن ہی چھپنا چاہیے۔میں نے اس کو سارے سٹیشنوں کو بھیجا کہ اس کو صفحہ دو پر چھاپیں۔اگلے دن پھر انہوں نے اسی پر لکھا۔حالانکہ جنرل ضیاء ؒ کو نوائے وقت کی پالیسیوں سے سخت دشمنی تھی۔اور وہ کہہ چکا تھا مجید نظامی صاحب کے حوالے سے ایک جلسے میں۔واپڈا ایڈیٹوریم میں، کہ جوان کے دماغ میں جمہوریت کا کیڑا ہے۔مجید نظامی بھی وہیں بیٹھے تھے۔یعنی ایک دوسرے سے دشمنی تھی۔دشمنی کہہ لیں یا اختلافات کہہ لیں۔مگر جب بات آئے گی۔تبصرے کی۔وہ ایک واقعہ تھا۔ایک حادثہ تھا۔اس کے بعد وہ پھر آنے والی جگہ پر آ گئے۔یعنی تیسرے صفحے پر آ گئے۔ان کا کالم تیسرے دن چھپتا تھا۔مگر یہ مجیب الرحمان شامی کے پاس ڈیلی پاکستان میں جب میں ملازمت کرنے لگا تو کوئی ایسا کالم میرا نہیں تھا۔جس کے اوپر اختلافی نوٹ نہ لکھا جاتا ہو۔یعنی ایک مرتبہ نہر پر پل بن رہا تھا۔میں نے لکھا کہ جو ایف سی کالج کا انڈر پاس ہے، اس کی کیا ضرورت ہے۔ایک طرف فیروز پور کا انڈر پاس ہے دوسری طرف جیل روڈ کا انڈر پاس ہے۔ہوسکتا ان کو اس کی ضرورت ہو۔اگر ایسا ہے تو پھر مسلم ٹاؤن کا پل انہوں نے گرا دیا۔شامی صاحب نے لکھا کہ فیروز پور والے جیل روڈ والا پل استعمال کرلیں۔کوئی بھی میرا کالم انہوں نے بغیر کے طور پر اختلافی نوٹ کے نہیں چھاپا۔تو یہ ایڈیٹری، ایڈیٹری کی بات ہے۔جب آپ کوئی چیز شائع کرتے ہیں۔آپ اس کو اون کرتے ہیں۔میں اس بات کو مانتا ہی نہیں، ہر اخبار کے اوپر نوٹ لکھا ہوتا ہے کہ کالم نگار کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔قانون اس بات کو نہیں مانتا۔قانون کہتا ہے کہ آپ اس کو اون کریں گے۔آپ ہی اس کے پبلشر ہیں۔یہ تو خیر اس کی بنیادی باتیں ہیں۔مگر میں نے آپ کو بنیادی نقطہ بطور ایڈیٹر جو ٹاپ کے لکھنے والے ہیں۔وہاں سے لے کر ٹاپ کے لکھنے والوں تک میرا واسطہ رہا ہے۔میری ان کی ورکنگ ریلیشن شپ رہی۔بہت اچھی بھی رہی۔لیکن پاکستان میں کسی دوسرے بندے کو یہ کریڈٹ حاصل نہیں ہے مگر شامی صاحب کو میں سینیئر ضرور سمجھتا ہوں۔نذیر ناجی کو یا کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔وہ مجھ سے بڑے ہیں۔کافی بڑے ہیں۔مگر ناجی صاحب نہ نوائے وقت کے ایڈیٹر رہے اور نہ جنگ کے۔اگر کہیں ایڈیٹر تھے وہ روزنامہ آزاد کے تھے۔اس کے علاوہ میں نہیں جانتا۔اگر صحافت میں ان کا نام آئے گا تو صرف ایک سرخی کے طور پر ''ادھر ہم، ادھر تم'' پر۔یا جس میں مولانا مودودی کا کارٹون چھاپا تھا کسی رقاصہ کا۔نیچے ننگا دھڑ تھا اور اس کے اوپر مولانا مودودی کا سر لگا دیا۔یہ دو کنٹری بیوشن ہیں ان کے صحافت میں۔مگر محمود شام سینئر ضرور ہیں۔بہت اچھا لکھتے ہیں۔نثر میں بھی، نظم میں بھی، لیکن وہ ایڈیٹر نہیں رہے۔نوائے وقت اور جنگ اپنے اپنے دور کے دو بڑے اخبار، دو بڑے ادارے جن میں میں ایڈیٹر تھا۔یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے مجھ پر۔اس اعزاز کو تاریخ میں محفوظ کیا جانا چاہیئے۔یہ اعزاز اور کسی کو نہیں جاتا۔

ارژنگ :۔آپ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستند ادیب بھی ہیں۔اپنی ادبی زندگی کے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیے؟

اسد اللہ غالب:۔میرا ادب سے رشتہ صرف وہی ہے جو میں تین سال گورنمنٹ کالج کے مجلہ راوی میں اس کا مدیر رہا۔وہ خالصتاً ایک ادبی پرچہ تھا۔جسے پاکستان کے ہر ادبی پرچے کے برابر رکھا جاسکتا تھا۔اتنا ہی وقیع تھا۔جتنا اوراق اور فنون تھا میرا خیال ہے کہ اور تو کوئی بڑا میگزین ان دنوں نہیں تھا۔تو اس میں میں نے نثر نہیں لکھی۔اس میں جب بھی کوئی میری چیز چھپی تو وہ نظم ہی تھی۔آزاد نظم بھی تھی۔زیادہ تر آزاد طرز میں تھی۔غزل میں نے نہیں لکھی۔مگر جو ادبی سرگرمیاں ہیں وہ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس میں ہوتی تھیں۔وہاں پنجابی کی محفل بھی ہوتی تھی اور اردو بھی ہوتی تھی۔ادھر کافی ہاؤس میں بھی ہوتی تھی۔میں جاتا تھا ادھر۔لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہاں طبقاتی کشمکش کی باتیں ہوتی تھیں۔کوئی لٹریری رمق ان میں نہیں تھی۔کسی غزل میں کوئی جان نہیں ہوتی تھی۔ہوسکتا ہے میں ایسی مجلسوں میں شریک نہ ہوا ، جہاں منو بھائی آتے ہوں، جہاں انتظار حسین آتے ہوں یا جہاں اشفاق احمد آتے ہوں۔میں جن جگہوں پر گیا۔وہاں پر تو لولے دبے لوگ تھے۔کسی نے غزل پڑھی یا کسی نے افسانہ پڑھا۔تو اس پر دھواں دھار

تنقید، یا اس کے جو نقائص ہیں ان پر بات ہوئی۔ ہم نے تو انگلش لٹریچر میں ایم۔ اے کیا۔ خواہ اس کا فہم کم ہی ہے۔ مگر یہ کہ تخلیق کو سراہا جاتا ہے۔ تنقید نہیں کی جاتی۔ Appriciation میں تنقید بھی آتی ہے۔ تنقید کا عنصر بھی اس میں شامل ہے۔ یہ نہیں کہ صرف تنقید ہے۔ یہ تو صرف تنقیص کے لئے تینوں چاروں ادارے تھے جہاں ان کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ میرا دل ان سے اچاٹ ہی رہا۔

ارژنگ: ۔ اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں لکھنے کا اتفاق ہوا؟

اسد اللہ غالب: ۔ میں نے پنجابی میں قلمی میگزین کا اجراء کیا جب میں سکول میں زیر تعلیم تھا غالباً نویں، دسویں، مگر راوی کے لئے جو دیہات کی لڑکیاں ہیں یا جو بڑی بوڑھیاں ہیں ان سے پوچھ پوچھ کے۔ ایک تو عام دوہڑے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی میں نے ڈھونڈے، جو پہلے کبھی نہیں چھپے تھے۔ مثلاً میرے گاؤں میں سو سال سے زیادہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اماں جی! کوئی ٹپہ سناؤ، تو یقین جانیں کہ اس کے اندر سے ایک الڑ دوشیزہ نے انگڑائی لی۔ یعنی وہی سو سوا سو سال کی جو عورت تھی، اس کا وہی لب ولہجہ ہو گیا، اس کی وہی کھنک۔ ایک جو دیہاتی دوشیزہ ہوتی ہے، مٹیار ہوتی ہے، اس لہجے میں اس نے مجھے وہ ٹپہ سنایا۔

گوری ساں چٹی، داغ لگ گیا تیرا
نہ دھوتیاں ای لہندا، نہ دھون دا ویلا
ہور مل مل دھونی آں، کھلر گیا بھتیرا

کمال کا ٹپہ ہے جی، اور کمال کا اس میں مسیج دیکھیں، معاشرتی رویہ ہے۔ جیسے سکینڈل پھیلتے ہیں، اور مل مل دھونی آں، کھلر گیا بھتیرا، اگر میں کہوں کہ سکینڈل جیسے پھیلتے ہیں، یہ ایک گندے الفاظ ہیں۔ مل مل دھونی آں، کھلر گیا دھیرا، بڑی چاشنی ہے بھائی اس میں۔ اک خاتون بولتی ہے، ایک باعظمت اور باحیاء لـ۔ ایک لڑکی بولتی ہے اور اور ایک الڑ مٹیار۔ جو عورت ہے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ تو اس طرح میں نے وہ بھی چھاپے۔ لیکن ادب سے میں پھر میں نے اپنی صحافتی مصروفیات کی وجہ سے رشتہ نہیں جوڑ سکا۔ ویسے بھی جب میں صحافی بن گیا تو میں لکھتا گیا۔ اور جب آپ زیادہ لکھتے ہیں تو وہ ادب کے پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔ یہ میرا ایک شدید احساس ہے۔ بہت لکھنے والے ادیب بھی ہیں جی۔ بھٹو نثر نے بہت لکھا، عمر نے بہت لکھا۔ شیکسپیئر نے بہت لکھا۔ لیکن وہ ادب ہے۔ مگر یہ جو اخباری تحریر ہے۔ یہ آدمی کو لٹریری تحریر سے بہت دور لے جاتی ہے۔ پیچ جیسے سمندر کی لہریں جھاگ کو کنارے پر پھینک دیتی ہے۔ یہ ایک لکھاری کو باہر پھینک دیتی ہیں۔ بھائی آپ ادیب نہیں ہیں۔ تخلیق کار نہیں ہیں۔ آپ نے لکھا لوگوں نے پڑھا۔ وہ گزر گیا۔ مگر پھر بھی کئی چیزیں ایسی لکھی ہیں میں نے۔ جن کو لوگ نہیں بھول سکتے۔ ان میں سے چند میری تحریریں ڈیفنس کے اوپر ہیں۔ ان کو میں نے دفاعی کتاب ضرب عضب کی شکل میں چھاپا۔ اور ایک کتاب اے وطن کے سجیلے جوانو کے اوپر چھاپا۔ آپ نے میری کتابوں کے بارے میں پوچھا تو میری ایک کتاب ہے ''فرار کی کہانیاں''۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ کیا کتاب ہوئی بھئی۔ یقین جانیں جب یہ کہانیاں اردو ڈائجسٹ میں چھپی تھیں۔ اور ان میں سے ایک کہانی میں قسط وار لکھ رہا تھا۔ چوتھی قسط لکھ رہا تھا تو ڈاکٹر اعجاز حسن اوپر ان کی رہائش تھی۔ نیچے میرے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ غالب صاحب اسی طریقے سے اس کہانی کو انجام تک بھی پہنچائیے۔ پھر مجھے تنگ کرتے ہیں کہ آگے کیا ہوا۔ آگے کیا ہوا۔ میں نے پھر چار پانچ کہانیاں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیں۔ تو میری سب سے بڑی Appriciation ہے۔ آپ شائد اسے مانیں یا نہ مانیں۔ جب میں عمرے پہ گیا تو اپنے دوست سعید احمد چمن جو اب پاکستان میں ڈپٹی گورنر سٹیٹ بنک بنے۔ اور بعد میں پنجاب بنک کے صدر بنے۔ اب وہ حدیبیہ کیس میں ECL میں پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا خاندان قطر میں ہے۔ تب وہاں یہ جدہ میں کسی کمپنی کے صدر تھے تو میں وہاں رات گیارہ بارہ بجے پہنچا ان کے پاس۔ تو میرے پاس وہ کتاب موجود تھی۔ فرار کی پانچ بڑی کہانیاں۔ تو وہ ان کے ڈرائیور نے لے لی۔ جب میں صبح اٹھا تو انہوں نے اٹھایا کہ چائے پی لیں اور عمرہ کرنے چلیں۔ تو وہ کہتا تھا کہ میں نے ساری رات جاگ کر یہ کتاب پڑھی۔ وہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ عام دیہاتی آدمی، تھا پاکستانی، میرے لئے یہ بہت بڑی تحسین تھی اور بہت بڑی توصیف۔ کہ کوئی آدمی اتنی دلچسپی سے اس چیز کو پڑھ سکے کہتا تو اسکو ادب ہے۔ بہرحال کچھ فقرے اس میں ایسے ہیں، جن سے میرے اندر کا ادیب جو ہے تو وہ جاگ جاتا ہے۔ اور کچھ فقرے سرزد ہو جاتے ہیں۔ جنہیں ادب کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو لٹریری آدمی نہیں کہتا۔ ادب کا شوقین ہوں اور آپ کا پرستار بھی۔

انٹرویو: کرنل (ر) سیّد مقبول حسین

ارژنگ: اپنے بچپن، ابتدائی زندگی، تعلیم اور ملازمت سے متعلق کچھ بتائیے۔

ج: میں جون 1942ء کو جالندھر میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کا ایک عجیب واقعہ ہوا جسے سن کر تعجب ہوتا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو ڈاکٹر نے مجھے مردہ قرار دے دیا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے مگر میری نانی نے آخری کوشش کے طور پر مجھے اُلٹا پلٹا تو میں رونے لگا۔ خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی بچپن میں میں خاصا بیمار رہا کرتا تھا لیکن سب کا بہت لاڈلا تھا۔ میری پیدائش پر میرے والد نے میرا نام پرویز حسین تجویز کیا مگر میرے نانا نے اختلاف کیا۔ یہ اسلامی نہیں گویا مقبول حسین رکھا گیا اور اپنا قلمی نام کرنل سیّد مقبول حسین لکھتا ہوں۔ قیامِ پاکستان کے وقت خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ پہلے ڈھیری حسن آباد، محلہ آریہ میں زیادہ وقت گزرا اور اب ہل ویوز اڈیالہ روڈ میں مستقل رہائش ہے۔ ابتدائی تعلیم مسلم ہائر سیکنڈری سکول سید پور سے حاصل کی۔ 1957ء میں مشن ہائی سکول راجہ بازار راولپنڈی سے میٹرک کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ 1962ء میں پاکستان آرمی کی سگنلز کور میں کمیشن مل گیا۔ میں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں حصہ لیا اور جنگی قیدی بھی بنا۔ 1976ء میں سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجویشن کرنے کے بعد ملٹری کالج آف سگنلز میں چیف انسٹرکٹر بھی رہے۔

ارژنگ: کیا آپ کو عسکری خدمات اعتراف میں کسی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ج: جی مجھے عسکری خدمات کے اعتراف میں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا جن میں سب سے بڑا ستارۂ امتیاز ملٹری بھی شامل ہے۔ 1993ء میں فوج کی نوکری مکمل کرنے کے بعد میں کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

ارژنگ: ادب کی طرف رُجحان کیسے ہوا؟

ج: ہمارے خاندان میں لکھنے کا شوق ہمیشہ سے ہے۔ ہمارے بزرگ سید عتیق اللہ شاہ اور سید علیم اللہ شاہ شاعری اور ادب کے میدان میں جوہر دکھاتے رہے۔ میرے چچا صاحبان سید امجد حسین اور سید احمد حسین بھی لکھتے تھے۔ چچا احمد حسین کی ایک کتاب نثر میں ''کالے پہاڑ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ چچا سیّد عطا حسین کلیم ریڈیو پاکستان سے منسلک تھے اور مشہور شاعر تھے۔ اس طرح خاندانی طور پر مجھے ادبی فضا ملی جس نے مجھے ادب اور شاعری کی طرف راغب کیا۔

ارژنگ: ابتدا میں آپ نے کس سے اصلاح لی؟

ج: میں شاعری میں غالب اور منیر نیازی سے متاثر رہا ہوں۔ کوئی بھی شخص بغیر اُستاد کے یا بغیر اصلاح کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح میں بھی سیکھنے کے عمل سے متواتر گزرا ہوں۔ ایک دوست جو پروفیسر تھے عبدالواسع اب اُن کا انتقال ہو گیا۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے میں ان سے باقاعدگی سے اصلاح لیتا رہا ہوں۔

ارژنگ: اب تک آپ کی کتنی تخلیقات منظرِ عام پر آ چکی ہیں؟

ج: میری اب تک جو تخلیقات منظرِ عام پر آ چکی ہیں ان میں ① تپش ② دل خاموش سوالی سائیں ③ گرفتار شب ④ زندہ رہے گا پاکستان ⑤ کیمپ 45 ⑥ عشق محمدؐ ⑦ تغافل ⑧ دھمال ⑨ کہکشاں ⑩ رُت بدلنے لگی ⑪ مٹی میں دکھ کے علاوہ کتابی سلسلہ ''حرف انٹرنیشنل''

ارژنگ: جب آپ ادب کی طرف آئے تو اُس وقت کون سے نامور لوگ منظر پر تھے؟ آپ کا حلقہ کون سا تھا؟

ج: جب میں ادب میں آیا تو اس وقت کے مشہور نام ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سرور کامران، یوسف حسن، جلیل عالی، اختر عثمان، روش ندیم، ارشد معراج، تابش کمال، آفتاب اقبال شمیم، سلطان رشک، علی محمد فرشی، راشد امین، سرور انبالوی، زبیر کنجاہی، محبوب ظفر، طارق نعیم، حمید شاہد، عابد سیال اور فاخرہ بتول سمیت کئی اور نامور لوگ دنیائے ادب میں برسرِ پیکار تھے۔ ان سب سے میرا ادبی رابطہ بہت مضبوط رہا۔

ارژنگ: 1971ء کی جنگ کے مشاہدات قارئین سے شیئر کریں۔

1971ء میں میری شمولیت مشرقی پاکستان محاذ پر رہی اور وہیں میں جنگی قیدی بنا۔ سقوطِ ڈھاکہ اور 1971ء ہماری تاریخ کے سیاہ ترین ایام تھے کہ پاکستان دولخت ہوا۔ میری کتاب کیمپ 45 اور زندہ رہے گا پاکستان۔ انہیں ایام کی یادداشتیں ہیں۔

ارژنگ: پبلشنگ کا تجربہ کیسا رہا؟

پبلشنگ کا تجربہ بہت اچھا رہا اور میں 1993ء سے کامیابی سے یہ کام کر رہا ہوں۔ ادیبوں، دوستوں سے تعلقات کو دیر پا رکھنے میں ''حرف اکادمی'' میرے ادارے کا بھی حصہ ہے۔

ارژنگ: حرف اکادمی کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

ج: ہمارے ہاں ادبی تنظیمیں اتنی فعال نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جو ادب دوستوں کے مسائل کو اپنی سطح پر حل کرنے کی کوشش کرے۔ بالخصوص اچھا لکھنے والے نوجوانوں کی پذیرائی اور سینئرز کی تخلیقات کا بڑا سرمایہ کتابی شکل میں محفوظ کیا جائے۔ اس سلسلے میں صرف اکادمی اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے۔

ارژنگ: زندگی میں کتنی بار محبت ہوئی؟

ج: زندگی میں محبت کو میں نے ایسے ہی دیکھا ہے جیسے جسونت سنگھ نے۔ محبت بار بار ہوئی کامیاب بھی ہوا اور لطف اندوز بھی۔ محبت کوئی زندگی کا روگ نہیں۔ یہی زندگی کی ضرورت ہے مجھے اپنے دوستوں، اردگرد کے ماحول اور ہر چیز سے محبت ہے۔

ارژنگ: مستقبل میں کون سی کتب زیرِ طبع ہیں؟

ج: زیرِ طبع کتب میں غزلوں کا نواں مجموعہ طوافِ ہجر ہے اور ''میری یادداشتیں'' جو یقیناً میری خاکوں کی کتاب کی طرح سب کو پسند آئے گی۔

ارژنگ: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ج: دوستوں کے لیے پیغام ہے کہ وہ محبت کریں نفرت نہیں پھول نہیں آستین کا سانپ نہیں۔

اُلفتوں میں ہو گئے نابود ہم
آستیں کا سانپ پر پلا رہا

مختصر ادبی خبریں

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

✦ میانوالی کے نوجوان شاعر عمران مفتی گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ وہ گزشتہ دو برس سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ''ہو نگاہِ کرم'' منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

✦ خیر پور ٹامے والی سے تعلق رکھنے والے شاعر حافظ مشتاق تنویر گزشتہ دنوں دارِ فانی سے کوچ کر کے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ''مہکتے پھول'' کے نام سے ان کی اُردو غزلیات کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

✦ گزشتہ دنوں نامور شاعر ڈاکٹر خالد جاوید جان کے بڑے بھائی سڑک حادثے میں انتقال کر گئے۔

✦ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ادیب شاعر، نقاد، محقق، مدیر زرنگار علامہ ضیاء الحسن ضیا گزشتہ دنوں لاہور میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

✦ آسمانِ ادب کا روشن ستارہ ممتاز شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار عاصم صدیقی دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

✦ جہلم کے معروف شاعر، ادیب اور ماہر تعلیم ارشاد حسین ارشاد رحلت فرما گئے ہیں۔

✦ اُردو اور پنجابی کے ممتاز فکشن نگار اور شاعر میر تنہا یوسفی (محمد صالح) انتقال کر گئے ہیں۔

✦ ماہنامہ تخلیق کے مدیر اعلیٰ سونان اظہر کو صدمہ اُن کی والدہ گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئیں۔

✦ پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈ کی سالانہ کانفرنس 19-20-21 کو مرنگ NCCP کی بلڈنگ میں منعقد ہوئی۔ اس میں پچیس برانچوں نے پاکستان بھر سے شرکت کی۔

✦ فروغِ سخن کے زیر اہتمام یونس دریام کے سفرنامے ''گڈ بائے لنکاوی'' کی تقریب پذیرائی 9 اگست کو پاکستان کرسچین ریکارڈنگ منسٹریز فیصل آباد میں منعقد ہوئی۔

✦ نامور اداکار شاہد کے ساتھ پلاک (PILAC) میں ایک شام کا اہتمام کیا گیا جس میں شوبز سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے ان کے فن کو سراہا۔

✦ معروف سفرنامہ نگار شاعر، مترجم، کالم نویس اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیر اعلیٰ پاکستان میں عید منانے کے بعد جاپان واپس چلے گئے۔ یہاں قیام کے دوران انہوں نے مختلف ادبی تقاریب میں شرکت کی۔

✦ جشن آزادی کے حوالے سے ریڈیو پاکستان کا آزادی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت امجد اسلام امجد نے کی۔ شعراء میں قائم نقوی، باقی احمد پوری، واجد امیر، عرفان صادق، حسن بانو، بینا گوئندی، شاہدہ دلاور، ناصر بشیر، منور سلطانہ بٹ، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر و دیگر نے شرکت کی۔ نظامت نیلما ناہید درانی نے کی۔ میزبان عفت علوی تھیں۔

✦ کاروانِ ادب مانٹریال کے زیر اہتمام چھٹا انٹرنیشنل مشاعرہ 31 اگست کو کینیڈا میں منعقد ہوا۔ جس میں کینیڈا کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی شعراء نے شرکت کی۔

✦ وارث شاہ کانفرنس 28 جولائی کو پنجابی کمپلیکس قذافی اسٹیڈیم لاہور میں منعقد ہوئی جس میں ہیر تحت اللفظ سے پڑھی گئی اور گائی گئی۔ مضامین پڑھے گئے۔

✦ گورنمنٹ ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ کے آڈیٹوریم میں امجد اسلام امجد کے نام ایک شام بسلسلہ یکجہتی کشمیر کا اہتمام کیا گیا۔

✦ اُردو اور پنجابی کے نامور شاعر ظفر اعوان کو بیلی ادبی و ثقافتی سوسائٹی ڈنمارک کا صدر منتخب ہونے پر ادبی حلقوں اور ماہنامہ ارژنگ کی ٹیم کی طرف سے مبارک باد۔

✦ آسٹریلیا سڈنی میں ماہی آرٹس کونسل کے زیر اہتمام شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں پاکستان سے انور مسعود اور خالد مسعود نے شرکت کی۔

✦ پاک برٹس آرٹس کونسل فیصل آباد کے زیر اہتمام برطانیہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر یونس امین شیخ کے پنجابی شعری مجموعہ ''اَنی دُھپ'' کی تقریب رونمائی اور عالمی محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔

✦ بزمِ انجم رومانی کا ماہانہ مشاعرہ صدر میں منعقد ہوا۔ ریاض رومانی ہر ماہ نہایت اہتمام سے مشاعرہ کا انعقاد کرتے ہیں۔

تبصرۂ کتب

نام کتاب : مسلمانوں کی قتل گاہ...... برما/مصنف: محمد فاروق عزمی/تبصرہ نگار: علامہ عبدالستار عاصم

ایک کتاب منصۂ شہود پر آ کر توجہ حاصل کر رہی ہے جس کا نام ''مسلمانوں کی قتل گاہ...... برما'' اس کے مصنف و مرتب روزنامہ ''خبریں'' کے مستقل کالم نگار محمد فاروق عزمی ہیں جنہوں نے ڈیڑھ دو برس کی مسلسل محنت اور تحقیق سے برما کے مظلوم مسلمانوں کیلئے اور دنیا کو ان کے مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے جو ایک قابل قدر کاوش ہے۔ بے حد حساس اور درد دل رکھنے والے قلمکار محمد فاروق عزمی نے امت مسلمہ کے ان بے بس اور لاچار مسلمانوں کے لیے قلم اُٹھایا ہے اور دنیا کے مُردہ ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے جنہیں دنیا نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور انھیں بری دہشت گردوں اور متعصب سیکورٹی فورسز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ''مسلمانوں کی قتل گاہ...... برما'' لکھنے کا محرک وہ احساس اور جذبہ ہے جس کا ذکر آقاﷺ کی اس حدیث مبارکہ میں ملتا ہے جس کا مفہوم ہے ''مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں جس کا ایک عضو تکلیف محسوس کرے تو مکمل جسم بخار اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔ اس سعی جمیلہ کیلئے مصنف بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میانمار (برما) کے روہنگیا مسلمانوں پر انسانی تاریخ کے بدترین تشدد اور ظلم و ستم کی داستانیں 2017 میں سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا کے سامنے آئیں۔ اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا بھی کچھ وقت کے لئے انگڑائی لے کر خوابِ غفلت سے بیدار ہوا۔ اس ایشو پر ٹاک شوز ہوئے، اخبارات میں کالم اور اداریے لکھے گئے او رپھر غفلت کی چادر تان کر برما کے مسلمانوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

برما کے مسلمان کئی دہائیوں سے اپنے مذہبی، سیاسی، سماجی اور انسانی حقوق سے محروم ہیں، ان پر تعلیم کے دروازے بند ہیں، روہنگیائی مسلمان دوسرے ممالک میں ہجرت کرنے پر مجبور ہیں بدھ مت کی تعلیمات عام کرنے کیلئے، مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ لاکھوں مسلمانوں نے جب ہجرت کر کے بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں پناہ کی تلاش پہنچے ہیں تو انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کی سرحد عبور کرتے ہوئے کئی بار تو انہیں سیکورٹی فورسز کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا اور سینکڑوں نہتے لٹے پٹے مسلمان مرد اور عورتیں گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

کتاب کا انتساب دل کا دامن کھینچتا ہے جو مصنف نے تاریک راہوں میں مارے گئے ان مسلمانوں کے نام کیا ہے جن کا درد کسی نے محسوس نہ کیا۔ ظلم دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے اور خاموشی سے اپنی دنیا میں مست رہنے والوں کیلئے حضرت سیدنا امام زین العابدین (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول ابتدائی صفحات میں لکھنے کے اغراض و مقاصد کا بہترین ابلاغ کراتا ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا تھا: ''مجھے اتنی تکلیف کربلا میں نہیں ہوئی جتنی کوفہ والوں کے خاموش رہنے پر ہوئی''۔ کوفہ ایک شہر کا نام نہیں بلکہ خاموش امت کا نام ہے جہاں پر بھی ظلم ہو اور امت خاموش رہے اس جگہ کوفہ اور لوگ کوفی ہیں۔

محمد فاروق عزمی ایک حساس اور درد دل رکھنے والے قلمکار ہیں۔ کتاب کے فلیپ پر جناب خالد اے مجید نے ان کاوش کو عظیم قلمی جہاد قرار دیا ہے جس سے کلی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ کتاب خوبصورت فور کلر صفحات کے ساتھ باتصویر عمدہ کاغذ اور طباعت سے آراستہ ہے اور قلم فاؤنڈیشن کی کتابوں کی فہرست میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام بڑے بک سٹال پر دستیاب ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں ان نمبروں پر رابطہ کریں۔ 0300-8422518, 0300-0515101۔

نام کتاب : تمہیں کو سوچنا ہے/شاعر: ناصر رانا/صفحات : 144/ قیمت : 300 روپے /تبصرہ نگار: نازاد کاڑوی

ناشر : اکادمیات (رجسٹرڈ)

ناصر رانا پنجابی ادبی حلقہ میں ایک خاص پہچان کے مالک ہیں۔ آپ نے پنجابی ادب میں تحقیق پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ ناصر رانا نہ صرف پروفیسری پیغمبری پیشے کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ صاحب طرز ادیب اور شاعر کے ساتھ ساتھ دو ادبی مجلّے ادبی معلّیٰ (اُردو) لیکھ (پنجابی کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ تحقیقی ادب پر سیر حاصل کتابیں شائع کرنے کے بعد ان کا اردو شعری مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ سوا حمد، نعت و منقبت غزل سے شروع ہوتا ہے۔ نظموں کے تڑکے نے مجموعہ کو چار چاند

لگا دیے ہیں۔ یہ مجموعہ اس لیے بھی معتبر معلوم ہوتا ہے کہ جاوید اختر بھٹی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر امجد طفیل جیسی معتبر ہستیوں نے بھی ناصر رانا کی شاعری کو خوش آمدید ہی نہیں مجموعہ کو اپنی نظر سے دیکھتے ہوئے شاعری پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں۔ بے شک ناصر رانا ایک زود گو حساس نظر دل کے مالک شاعر ہی نہیں حسن اخلاق کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں بانکپن ہے وہاں سنجیدگی بھی ہے۔ خسرے میں پھیلی ہوئی بیماریوں اور تعفن زدہ ماحول، بدبودار فضا میں رہتے ہوئے اپنے اشعار سے معاشرہ کو جھنجھوڑتے بھی ہیں اور مہکتے ہوئے افکار سے تعفن سے اپنے قاری کو دور لے جانے میں بھی کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے قارئین بھی ناصر رانا کی شعری کاوش کو ضرورت ستائش کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

نام کتاب : نور ہی نور ہے/شاعر: عمران سلیم/صفحات : 128 / قیمت : 300روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر : مکتبہ شافی 1 / 13 شافی چوک کریم پارک راوی روڈ لاہور

عمران سلیم ادبی دنیا کا ایک چمکتا ہوا تارا، یہ تارا سجتا ہے ادبی دنیا کے چاند اُستاد منظور وزیرآبادی کے ساتھ۔ میری مراد اُستاد منظور وزیرآبادی کے ہونہار شاگرد عزیز عمران سلیم، اُردو پنجابی میں یکساں روانی کے ساتھ روایت کے ساتھ ساتھ محبت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اب تک 19 مجموعات اپنے قارئین کو شاعری کے ساتھ اپنی محبت کے طور پر دان کر چکے ہیں۔ عمران سلیم کے ہر مجموعہ میں بحروں کا ایک نہ ایک نیا تجربہ اور شاعری میں منفرد اسلوب میں دکھائی دیتا ہیں۔ حالیہ مجموعہ ''نور ہی نور ہے'' حمد اور نعت پر مشتمل ہے۔ جہاں مختلف بحور میں لکھی گئی مختلف نعتیں و دیگر صنفوں میں بھی طبع آزمائی نظر آتی ہے۔ اس میں غزلیہ، نظمیہ و مسدس رنگ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس طرح ان کی کہنہ مشقی قاری کو متاثر کیے بنا نہیں رہتی۔ طویل بحریں، طویل نعتیں عمران سلیم کی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جذباتی ہی نہیں روحانی وابستگی بھی ظاہر کرتی ہے۔ عمران سلیم نے حضور ﷺ کے عشق و سرمستی میں ڈوب کر نعتیں کہی ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ عمران سلیم کا یہ خراج عقیدت قبول کرے۔ آمین

اُمید ہے قارئین بھی نعتیہ مجموعہ پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کریں گے۔

نام کتاب : جب ہم بچھڑے تھے/شاعر: امجد شریف/صفحات: 112/ قیمت : 250روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

پبلشرز : عالم پبلی کیشنز دربار مارکیٹ لاہور

حال ہی میں مارکیٹ میں چھپ کے آنے والا امجد شریف کا اردو شعری مجموعہ ''جب ہم بچھڑے تھے'' موصول ہوا۔ امجد شریف اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے ہیں۔ ان کی شاعری حقیقت کے قریب تر لگتی ہے۔ چھوٹی بحروں کا استعمال امجد شریف کی کہنہ مشق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چھوٹی بحر میں بڑے واقعہ کو چھوٹا کر کے بیان کرنا مشق سخن کے بغیر ممکن نہیں۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت شریف کا نذرانہ بھی شامل کلام ہے۔ امجد شریف نثر لکھنے میں مہارت رکھتے ہوئے ایک ادبی پرچہ ''وادیٔ ادب'' کی ادارت بھی کرتے ہیں۔ آج کل ''ہائیکو'' لکھنے کا رواج چل پڑا ہے۔ امجد شریف نے بھی نعتیہ ہائیکو کے ساتھ ساتھ نعتیہ ''ماہیا'' بھی تخلیق کیا ہے جو پڑھنے والے کے دل پہ اثر کیے بنا نہیں رہتا۔ اس مجموعہ پر اقبال نجمی اور پروفیسر آصف جاوید اور امجد شریف کے دوست وسلیم عالم نے بھی اپنی آراء سے مجموعہ کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔

نام کتاب : کچھ لوگ پہچانے گئے/مصنف: مقبول احمد شاکر/صفحات: 254/ قیمت : 400روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

مقبول احمد شاکر صاحب شعبہ تدریس سے وابستہ جہاں علم کی قندیلیں روشن کر رہے ہیں وہاں گلستان ادب میں طرح طرح کے گلاب اُگانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں تو کہیں اپنے طنزیہ، مزاحیہ انداز میں آسمان ادب پر نئے ستارے دریافت کرتے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ مجموعہ '' کچھ لوگ پہچانے گئے'' جہاں شگفتہ تحریریں دل کو گداز کرتی ہیں وہاں ان کی برجستہ شاعری چہروں پر مسکراہٹ بھی بکھیرتی ہے۔ مقبول شاکر نے اپنی سروس کے دوران ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نہایت شستہ پیرائے میں قلمبند کر کے اپنے علمی ادبی ذوق کی خوب آبیاری کی ہے۔ نہایت سادہ زبان میں اپنی تحریر کو لفظوں کی چاشنی اور برموقع ضرب الامثال محاوروں اور شعری ٹانکے لگا کر ادبی پھلکاری کاڑھی ہے جو دیکھنے میں خوبصورت لگتی ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ رموز بحر سے آشنا تمام اصناف پر عبور رکھتے ہیں۔ اردو، پنجابی سنجیدہ اور مزاح میں ایک انفرادیت قائم کیے ہوں۔ اُمید ہے قارئین '' کچھ لوگ پہچانے گئے'' کو ضرور پسند کریں گے۔

نامہ ہائے احباب

صاحب نغز و شعور صاحب صاحبان خوبصورت شاعر حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ نے گوشہ چشمے ادھر کیا۔ ہم تین ہزار یوال شعری گوشے کے سزاوار قرار پائے۔ گویا بے قراری دور ہوگئی۔ ظاہر ہے نسیم عباسی اور پرویز ساحر بھی بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ ہزارے میں ہیرے جواہرات کی کمی نہیں۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ آپ نے میری غزلیں کتاب ''اکتفا'' سے لی ہیں۔ کہتے ہیں پہلی پھڑک اُٹھی ہے۔ ارژنگ ٹائٹل کے سلسلہ میں حُسن روایت کی پاس داری کرتا ہے۔ اب کے بھی ٹائٹل خوب صورتی کے ساتھ ساتھ کئی معنویتیں رکھتا ہے۔ ذرا غور کی ضرورت ہے۔ رسالے کے صفحات دلچسپ ہیں۔ موٹے اور چھوٹے لوگ کھوٹے کھوٹے ہو گئے ہیں۔ اب چھیل چھبیلے لوگ درکار ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا فریدہ خانم سے متعلق مضمون پسند آیا۔ فریدہ خانم سُر اور سوز میں یکتا رہیں۔ ان کی ''ادائی'' کی کیا کہنے۔ رسالے میں ہر بار دو پہنچے ہوؤں کا انٹرویو ہوتا ہے۔ یہ سوالات جس پر بھی کرو گے جوابات وہی ہوں گے جو ہوتے ہیں۔ اس طرف بھی گرمی ہے وہ تو کہیے سہ پہر کو چھینٹا پڑ جاتا ہے۔ اس سے قدرے سہولت ہو جاتی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن والی۔ لاہور لاہور ہے۔ اس کی گرمی گرمی ہے۔ فالودہ، آئس کریم اور دیگر لوازم اپنی جگہ! ارژنگ کا انتظار رہتا ہے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم حسن عباسی! ارژنگ کی خوب سے خوب تر اشاعتیں ہمیشہ فرحت افزا ہوتی ہیں۔ میں انھی اشاعتوں میں تخلیق حُسن کو روز افزوں رضا خوں پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ادب سرائے ساہیوال کی ماہانہ مجلسوں میں بھی ارژنگ کے ہر آن تر و تازہ پرچوں کا تذکرہ خیر ہوتا ہے۔ ایک تازہ نعت ارسال کر رہا ہوں۔

سیّد ریاض حسین زیدی، ساہیوال

---

۲۳ جون ۲۰۱۹ء

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کی خوبصورت کتاب ''صاحب'' ملی۔ اس عنایت کا شکریہ!! آپ کے حسب فرمان اس کے بارے میں مضمون لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ پسند آئے گا۔ آپ کا رسالہ ''ارژنگ'' مل رہا ہے۔ شکر گزار ہوں ایک انگریزی اور ایک سرائیکی کتاب آپ کو بھیجی تھی۔ ان دونوں پر ''ارژنگ'' میں تبصرہ کرا دیں۔ منتظر ہوں۔

مخلص

ڈاکٹر قاسم جلال، بہاولپور

جناب حسن عباسی! آداب!!

اُمید ہے بخیر ہوں گے۔ رسید دینے میں دیر ہوئی معذرت۔ پچھلے دنوں پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈ کانفرنس میں لگی رہی۔ اس کی چھوٹی سی رپورٹ ارژنگ کے لیے حاضر خدمت ہے۔

ایک نظم کے ساتھ لبنی کو میرا اسلام کہیے۔ آپ سب کی سلامتی ہو۔

آسناتھ کنول

لاہور

عزیزم عامر بن علی! عزیزم حسن عباسی!

ممنون ہوں ارژنگ سے نواز رہے ہیں۔ عمدہ تحریریں پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ نظمیں، غزلیں بھی عمدہ ہیں۔ آپ کی محنت اور لگن سے ہی یہ سب ممکن ہے۔ بہت عرصہ ہوا ارژنگ میں خود کو نہیں پایا۔ آئندہ شمارے کے لیے تین کہانیاں اور دو غزلیں بھیج رہی ہوں۔ والسلام

تسنیم کوثر، لاہور

اسلام علیکم۔ عامر بن علی اور حسن عباسی صاحب خداوند آپ کو، آپ کی پوری ٹیم اور فیملی کو برکتوں سے مالا مال کرے۔ ''ارژنگ'' کے لیے تازہ کلام بھیج رہی ہوں اُمید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ برائے مہربانی رسالہ بھی بھیج دیا کریں۔

مخلص

کہکشاں بھٹی، گوجرانوالہ

محبت زندگی کا روگ نہیں، زندگی کی ضرورت ہے

شاعری میں غالب اور منیر نیازی سے متاثر ہوں

نامور ادیب

کرنل (ر) سیّد مقبول حسین

سے معروف شاعرہ اور کالم نویس

لبنیٰ صفدر

کی گفتگو

ہمارے خاندان میں لکھنے کا شوق ہمیشہ سے ہے

◉ اپنے بچپن، ابتدائی زندگی، تعلیم اور ملازمت سے متعلق کچھ بتائیے۔

◉ میں جون 1942ء کو جالندھر میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کا ایک عجیب واقعہ ہوا جسے سن کر تعجب ہوتا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو ڈاکٹر نے مجھے مردہ قرار دے دیا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے مگر میری نانی نے آخری کوشش کے طور پر مجھے اُلٹا پلٹا تو میں رونے لگا۔ خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی بچپن میں میں خاصا بیمار رہا کرتا تھا لیکن سب کا بہت لاڈلا تھا۔ میری پیدائش پر میرے والد نے میرا نام پرویز حسین تجویز کیا مگر میرے نانا نے اختلاف کیا۔ یہ اسلامی نہیں گویا مقبول حسین رکھا گیا اور اپنا قلمی نام کرنل سیّد مقبول حسین لکھتا ہوں۔ قیامِ پاکستان کے وقت خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ پہلے ڈھیری حسن آباد، محلّہ آریہ میں زیادہ وقت گزرا اور اب ہل ویوز اڈیالہ روڈ میں مستقل رہائش ہے۔ ابتدائی تعلیم مسلم ہائر سیکنڈری سکول سید پور سے حاصل کی۔ 1957ء میں مشن ہائی سکول راجہ بازار راولپنڈی سے میٹرک کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ 1962ء میں پاکستان آرمی کی سگنلز کور میں کمیشن مل گیا۔ میں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں حصہ لیا اور جنگی قیدی بھی بنا۔ 1976ء میں سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجویشن کرنے کے بعد ملٹری کالج آف سگنلز میں چیف انسٹرکٹر بھی رہے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

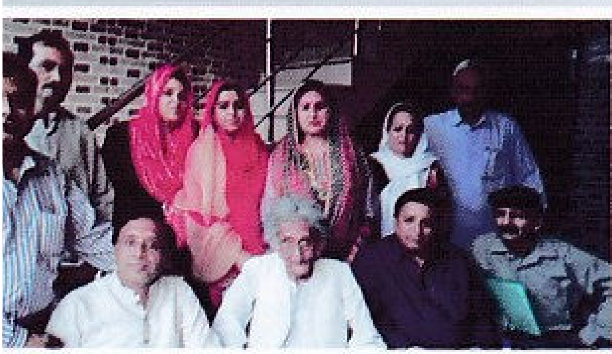

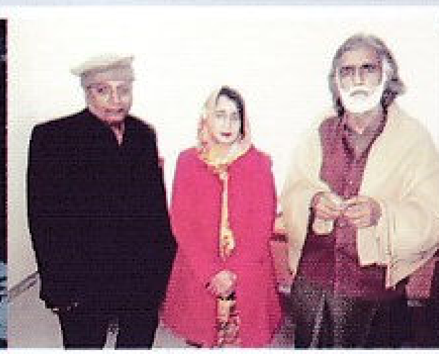

معروف شاعر، ناموراديب اور منفرد کالم نگار، مدیر اعلی ارژنگ

"عامر بن علی کی شاعری کا انگریزی و روسی ترجمہ"

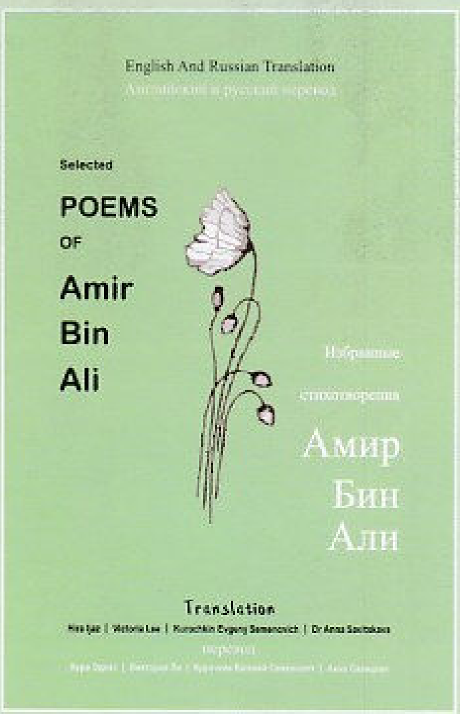

Translation

Hira Ijaz | Victoria Lee | Kurochkin Evgeny Semenovich | Dr Anna Savitskava

اشاعت کے آخری مراحل میں ہے

Selected Poems of
Amir Bin Ali

Избранные стихотворения
Амир Бин Али

بہت جلد اہم کتب خانوں اور آن لائن دستیاب ہوگی

مفت آن لائن پڑھنے کے لیے درج ذیل ویب سائیٹ ملاحظہ فرمائیں

www.amirbinali.com
www.millat.com

ناشر: نستعلیق مطبوعات 40-اردو بازار لاہور

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com